Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

یکم و ۱۶ جولائی ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۱۳۔۱۴

پندرہ روزہ
# معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲_۲۱)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور وفکر کے لیے اہم یا مفید ہوسکتی ہیں۔
۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔
۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

## بنگلا دیش: طلبہ احتجاج، حکومت مخالف تحریک میں کیسے تبدیل ہوا؟

**شیما صدیقی**

بنگلا دیش کی ۱۷ کروڑ آبادی اس وقت مکمل طور پر دنیا سے کٹ چکی ہے۔ دنیا کے تیزی سے ترقی کرنے والے ممالک میں شامل بنگلا دیش کو اُس وقت شدید سیاسی عدم استحکام کا سامنا کرنا پڑا کہ جب ۵ جون ۲۰۲۴ء کو بنگلا ہائی کورٹ نے ۲۰۱۸ء میں ختم کیے گئے کوٹہ سسٹم کو بحال کردیا۔

اس وقت بنگلا دیش میں انٹرنیٹ بند اور سڑکوں پر کرفیو نافذ ہے۔ عدالتی فیصلہ سامنے آنے کے اگلے دن سے شروع ہونے والے طلبہ کے احتجاج کو پوری دنیا نے پُرتشدد ہنگاموں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ شیخ حسینہ واجد نے طلبہ کو طاقت کے زور پر دبانے کی کوشش کی اور عوامی لیگ کی طلبہ تنظیم 'چھاترا لیگ' نے کوٹہ سسٹم کے خلاف سڑکوں پر آنے والے مظاہرین کو تشدد کا نشانہ بنایا لیکن طلبہ کے جذبات کو اُس وقت ٹھیس پہنچی جب شیخ حسینہ واجد نے ۱۶/جولائی کو ایک غیر ذمہ دارانہ بیان دیا جس نے منظم اور پُرامن طلبہ مظاہرین کے جذبات کو بھڑکایا۔

### بنگلا دیش سے تازہ ترین اطلاعات

تازہ ترین پیش رفت میں ۲۱ جولائی کو سپریم کورٹ نے سراپا احتجاج طلبہ کے مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے ۳۰ فیصد کوٹہ کم کر کے ۵ فیصد کوٹہ ہنوز برقرار رکھا۔ ایک فیصد مخنث جبکہ ایک فیصد معذوروں کے لیے مختص ہے۔ عدالت نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ حکومت اس تناسب کو تبدیل کرسکتی ہے۔

۲۳ جولائی کو کرفیو میں چند گھنٹوں کی نرمی کی گئی۔ تاہم تمام تعلیمی ادارے غیر معینہ مدت کے لیے بند ہیں، یہاں تک کہ کئی ہوسٹلز بھی خالی ہوچکے ہیں۔ طلبہ کا اب صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ شیخ حسینہ جاں بحق افراد کے لواحقین سے معافی مانگیں۔

ڈھاکا میں مقیم ڈاکٹر سید نوید مشتاق نے ''ڈان اردو ڈیجیٹل'' کے رابطے کرنے پر کئی دنوں بعد ۲۴ جولائی کو ہمیں جواب دیا کہ 'ڈھاکا میں ۵ دنوں سے انٹرنیٹ بند اور مکمل میڈیا بلیک آؤٹ ہے۔ اشیائے خورونوش کی قلت ہوچکی ہے جبکہ دستیاب اشیا کئی گنا زائد قیمتوں پر فروخت ہورہی ہیں۔ ایک درجن انڈے ۱۸۵ ٹکا کے حساب سے دستیاب ہیں'۔

ڈھاکا میں تعینات پاکستانی ہائی کمشنر سید معروف کا کہنا ہے کہ 'حالات بہتری کی طرف جارہے ہیں۔ کرفیو میں زیادہ دیر کے لیے نرمی کی گئی ہے لیکن حالات ابھی بھی مکمل طور پر معمول پر نہیں۔ پاکستانی طلبہ محفوظ ہیں اور ہم سب سے رابطے میں ہیں، ساتھ ہی پاکستان میں موجود ان کے خاندانوں تک ان کی خیریت کی خبریں بھی پہنچا رہے ہیں کیونکہ مواصلاتی ذرائع ابھی بحال نہیں ہوئے ہیں۔ پاکستانی ہائی کمیشن کی ٹیم بھی پاکستانی طلبہ کے ساتھ موجود ہے'۔

ان تمام پُرتشدد ہنگاموں کی خبروں میں کئی بار پاکستان کی بازگشت سنی گئی۔ لہٰذا ہم اس مسئلے کو ابتدا سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر یہ مسئلہ ہے کیا؟ ساتھ ہی یہ سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ جنوری ۲۰۲۴ء میں مسلسل چوتھی بار وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھانے والی شیخ حسینہ واجد کی ۱۵/سالہ حکومت اس بار صرف سیاسی ہچکولے کھائے گی یا واقعی اس بار ان کی حکومت خطرے میں ہے؟

### کوٹہ سسٹم کیا ہے؟

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان الگ ہوکر بنگلا دیش بن گیا اور اس دوران پاکستان سے آزادی کے لیے جنگ لڑنے والے بنگلا دیش کے ہیرو کہلائے۔ ان جنگی ہیروز کے خاندانوں کو سرکاری نوکریوں بالخصوص سول سروسز میں مخصوص کوٹہ سے نوازا جاتا رہا اور یہ سلسلہ کئی دہائیوں تک جاری رہا۔ لیکن ۲۰۱۸ء میں طلبہ کے پُرزور احتجاج پر اس کوٹے کو ختم کردیا گیا تھا۔

واضح رہے کہ ۲۰۱۸ء میں بھی حکومت نے طلبہ کے احتجاج کے پیشِ نظر صرف فرسٹ اور سیکنڈ کلاس ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم کو منسوخ کیا تھا یعنی مکمل طور پر اسے منسوخ نہیں کیا گیا تھا۔ حکومتی فیصلے کے خلاف ۲۰۱۸ء میں ہی عدالت میں ایک درخواست دائر کی گئی تھی۔ بنگلا عدالت نے ۵ جون ۲۰۲۴ء کو اس درخواست کا فیصلہ سناتے ہوئے مخصوص کوٹہ بحال کردیا۔ فیصلے کے اگلے ہی دن یعنی ۶ جون کو ہی طلبہ نے ڈھاکا یونیورسٹی میں احتجاجی ریلی نکالی۔

### ہنگامے آخر کیوں پھوٹ پڑے؟

پُرامن احتجاج جاری تھا۔ ابتدا میں چند عام بنگالی طلبہ

اندرونی صفحات پر:

- فلسطینی مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی غیر قانونی موجودگی!
- ڈھابوں کی مذہبی پہچان اور بی جے پی کا خوف
- امریکی انتخابات: جو بائیڈن دستبردار، اب کیا ہوگا؟
- زخمی ٹرمپ کی تصویر امریکی انتخابات کا رخ بدلے گی؟
- امریکا نازک ترین سیاسی موڑ پر
- غزہ کی قیمت ہماری جیب بھی دے رہی ہے!
- افغانستان میں غیر ملکی سیاحوں کی دلچسپی کیوں؟
- دنیا کو مفلوج کرنے والے سافٹ ویئر، چین کیسے محفوظ رہا

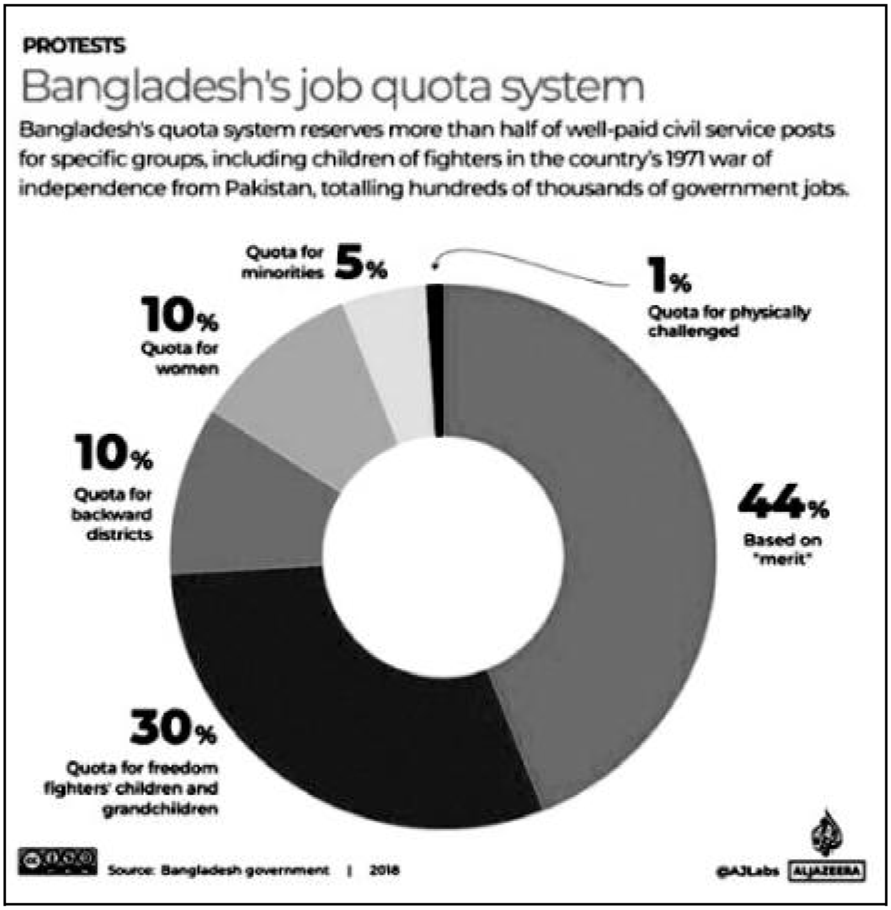


اپنے سماجی حقوق کے لیے سامنے آئے اور یوں دیگر طلبہ بھی ہم آواز ہوتے چلے گئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں مظاہرے ہونے لگے۔ احتجاج میں ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبہ زیادہ متحرک نظر آئے اور زیادہ ہنگامے بھی اسی کے کیمپس میں ہوئے۔ ۱۵/ جولائی تک طلبہ کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ حکومت آئینی اصلاح کرتے ہوئے اس قانون کو مکمل طور پر منسوخ کرے۔ کوٹہ نظام حق تلفی اور میرٹ کے خلاف ہے۔ تمام لوگوں کو ان کی محنت کے مطابق سرکاری نوکریاں ملنی چاہئیں۔

اس وقت تک مظاہرین سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے تاہم حالات بے قابو نہیں ہوئے تھے لیکن شیخ حسینہ کے سیاسی بیان نے اس منظر نامے میں ہلچل مچادی اور طلبہ کو بیخ پا کر دیا۔ شیخ حسینہ نے ۱۶/ جولائی کو مظاہرین کے کوٹہ نظام کے مکمل خاتمے کے نعروں کا مذاق اڑاتے ہوئے انہیں ۱۹۷۱ء میں پاکستانی فوج کی مدد کرنے والے گروہ یعنی 'رضا کار' سے تشبیہ دی۔

طلبہ اور ان کے والدین نے اسے توہین کے زمرے میں لیا اور پورے بنگلا دیش کے نوجوان شدید مشتعل ہوگئے کیونکہ پاک فوج کی مدد کرنے والوں کو اُس وقت مکتی باہنی کے لوگ 'رضا کار' کے نام سے پکارتے تھے یعنی احتجاج کرنے والے طلبہ پاکستانی فوج کے ساتھی ہیں۔

شیخ حسینہ کے طنز کے جواب میں طلبہ نے بھی خوب نعرے بلند کیے کہ 'تم کون ہو؟ میں کون ہوں؟ رضا کار، رضا کار'، ہم نے مانگا تھا اپنا ادھیکار (حق) مگر ہمیں بنا دیا گیا ہے رضا کار'۔ چند ہی گھنٹوں میں طلبہ کا مظاہرہ حکومت مخالف مظاہرے میں تبدیل ہوگیا اور اس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ لے لیا۔ یہاں تک کہ حکومت کو ملک میں کرفیو لگا کر 'سرکاری چھٹی' کا اعلان کرنا پڑا۔

ان پُرتشدد حالات کو دوسرا ہفتہ ہوا چاہتا ہے لیکن حالات قابو میں نہیں آرہے۔ یہاں تک کہ مظاہرین نے سرکاری ٹی وی کی عمارت پر بھی حملہ کیا کیونکہ ان کے نزدیک چلائی جانے والی خبریں حکومتی مؤقف کی تائید کرتی ہیں۔

بعدازاں شیخ حسینہ نے اپنے بیان پر کہا کہ ان کے بیان کا غلط مطلب اخذ کیا گیا۔ ساتھ ہی عوامی لیگ کی طلبہ تنظیم 'چھاترا لیگ' نے سراپا احتجاج طلبہ و طالبات کو تشدد کا نشانہ بنایا اور اس دوران پولیس بھی ان کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ پُرتشدد ہجوم کے ہاتھوں ۱۵/ جولائی کو ایک طالب علم ہلاک ہوا اور اگلے ہی دن یہ تعداد بڑھ کر ۱۰/ اور پھر تازہ ترین اطلاعات تک مرنے والوں کی تعداد ۱۷۵/ سے تجاوز کرچکی ہے۔ سرکاری ٹی وی بند اور انٹرنیٹ بندش کے باعث اموات کی حتمی تعداد واضح نہیں۔

## سرکاری نوکریاں اہم کیوں ہیں؟

بنگلا دیش اس وقت ۶ فیصد کی رفتار سے دنیا کی تیز ترین معیشتوں میں شمار کیا جاتا ہے جبکہ ایک کروڑ ۸۰ لاکھ نوجوان یہاں بستے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ حسینہ کی حکومت میں ملک نے بہت ترقی کی ہے لیکن یہ کپڑے کی صنعت کی وجہ سے ہے کہ جہاں خواتین بطور اسکل ورکرز کام کررہی ہیں۔

کپڑے کی صنعت میں زیادہ تر بلیو کالر نوکریوں کی گنجائش ہے جبکہ پروفیشنل تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے یہاں نوکریاں کم ہیں۔ پھر جب سرکاری نوکریوں پر بھی کوٹہ سسٹم نافذ ہو تو نوجوانوں کا ذہنی انتشار کا شکار ہونا حق بجانب ہے کیونکہ انہیں اپنا مستقبل روشن اور بہتر نظر نہیں آرہا۔

معاشی ترقی سے عام بنگالیوں کی زندگیوں میں استحکام آیا ہے لیکن جامعات سے گریجویٹ نوجوان میرٹ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ''الجزیرہ'' نے ۲۰۱۸ء کے سرکاری دستاویزات کے مطابق بتایا ہے کہ ۴۴ فیصد نوکریاں میرٹ پر تھیں۔ ۳۰ فیصد نوکریوں پر مراعات یافتہ طبقے کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ ۱۰/ فیصد نوکریوں پر خواتین اور دیہی علاقوں کے شہریوں کا حق جبکہ ۵ فیصد کوٹہ اقلیتی گروہ کے لیے مختص کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک فیصد کوٹہ معذوروں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ تمام تر صورتحال میں نوجوان کی ایک بڑی تعداد سمجھتی ہے کہ ۳۰ فیصد کوٹے سے صرف عوامی لیگ کے ووٹرز ہی مستفید ہوتے ہیں۔

## ماہرین کی آرا

جامعہ کراچی کے شعبہ بین الاقوامی تعلقات کی ماہر، سماجی علوم اور قانون کی ڈین ڈاکٹر شائستہ تبسم کہتی ہیں، 'یہ ہنگامے ایک دم نہیں پھوٹ پڑے، یہ لاوا کئی سالوں سے پک رہا تھا۔ بالخصوص حالیہ انتخابات میں بڑے پیمانے پر ہونے والی دھاندلی پر صرف حزب اختلاف نے ہی نہیں بلکہ دنیا نے بھی آواز اٹھائی تھی۔ یہ غیر مقبول حکومت ہے۔ مخالفین ہی نہیں بلکہ سیاسی جماعتیں بھی سمجھتی ہیں کہ عوامی لیگ کی بنیادی سوچ ہے کہ اٹھنے والی ہر مخالف آواز کو دبا دیا جائے۔ عرصے سے پلنے والی اس سوچ کی وجہ سے لوگوں نے کوٹہ سسٹم کے مکمل خاتمے کی تائید کی۔

'اس وقت بنگلا دیش میں میڈیا پر پابندی ہے لیکن ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس تحریک کا کوئی واضح رہنما نہیں ہے۔ مذاکرات کے لیے واضح نکات ہونا ضروری ہیں اور یہ عام طلبہ کا گروپ ہے جنہیں سیاست نہیں آتی'۔

ڈاکٹر شائستہ نے بتایا کہ 'شیخ حسینہ بنگلا دیش کی فوج کی حمایت کر رہی ہے جس کی وجہ سے وہ مسلسل ۴ بار وزیراعظم منتخب ہو چکی ہیں۔ چند سال پہلے بنگال رائفل شیخ حسینہ کی بڑی مخالف بن کر ابھری تھی لیکن اسے بری طرح کچل دیا گیا تھا'۔

سینئر صحافی منزہ صدیقی نے کہا کہ 'شیخ حسینہ کی حکومت میں بنگلا دیش نے ترقی کی ہے اور آج ہم ڈھاکا کی سڑکوں پر میٹرو بس چلتی دیکھتے ہیں۔ لیکن بظاہر بنگلا دیش کی فوج تشدد کی حمایت کرتی نظر نہیں آتی۔ وہ ۱۸ر جولائی سے پہلے بھی باہر نکلی تھی لیکن اس نے طلبہ کے خلاف جانا مناسب نہیں سمجھا اور بیرکوں میں واپس چلی گئی لیکن بدھ ۱۷ر جولائی کو ۳۲ افراد کی ہلاکت کے بعد انہیں واپس آنا پڑا جبکہ دوسری جانب حکومت کرفیو نافذ کر کے ہنگاموں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہے'۔

انہوں نے یاد کرتے ہوئے بتایا کہ 'چند سال پہلے بھی طلبہ اسی طرح اپنے سماجی حق کے تحفظ کے لیے سڑکوں پر نکلے تھے۔ یہ مظاہرے حادثات میں کئی بچوں کی اموات کے بعد سڑکوں کی مرمت اور نئی سڑکوں کی تعمیر نہ ہونے کے خلاف تھے۔ یوں بنگلا دیش میں سماج کی بہتری کے لیے طلبہ کے آگے آنے کی روایت پرانی ہے۔ حکومت کو سمجھنا چاہیے کہ اس وقت بنگال میں ۵۲ فیصد نوجوان ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا'۔

جامعہ کراچی میں بین الاقوامی تعلقات کے استاد، بنگلا دیش پر کئی ریسرچ پیپر لکھنے اور ۲۰۰۲ء میں ڈھاکا یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کے وزیٹنگ ٹیچر رہنے والے ڈاکٹر مونس احمر کہتے ہیں کہ 'بنگلا دیش میں ڈھاکا یونیورسٹی اور طلبہ یونین کا کردار ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ بنگلا دیش کے قیام سے پہلے اور بعد میں بھی بنگالی طلبہ اپنے حقوق کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ پہلے سنا تھا کہ کیسے مشرقی پاکستان میں طلبہ یونین انسانی اور سماجی حقوق کے لیے کھڑی رہی ہے۔ میں نے جب وہاں چند سال گزارے تو میں نے کئی مواقع پر طلبہ کو اپنے حق کے لیے لڑتے اور انہیں کامیاب ہوتے دیکھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں ہڑتال کا انداز بھی منفرد ہے کہ جہاں آدھا دن ہڑتال رہتی اور باقی دن معمولات زندگی چلتے رہتے'۔

موجودہ حالات کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ 'حالیہ احتجاج میں اموات نے موجودہ حکومت کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور بظاہر صورتحال بگڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ۱۵ر سال سے چلنے والی شیخ حسینہ واجد کی حکومت معاشی اصلاحات لانے میں کامیاب رہی ہے لیکن حالیہ عالمی کساد بازاری سے دنیا کے دیگر ممالک کی طرح بنگلا دیش میں بھی مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے جس سے عوام متاثر ہوئے ہیں'۔

ڈاکٹر مونس احمر موجودہ حالات کو شیخ حسینہ واجد کی سیاسی غلطی قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا بنگالی عوام ہمیشہ سے ہی اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے آئے ہیں۔ اردو زبان کا مسئلہ ہو یا ۱۹۶۰ء یا ۱۹۷۰ء کی دہائی کے مسائل۔ لیکن تازہ ترین واقعات اس لیے شدت اختیار کر گئے کہ ڈھاکا یونیورسٹی اور میڈیکل کالج سے شروع ہونے والا طلبہ کا احتجاج پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ موجودہ حکومت پر پہلے ہی انتخابات میں دھاندلی کے الزامات ہیں۔ یہاں تک کہ امریکا نے بھی ان کے حالیہ انتخابات کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر مونس احمر پُرامید ہیں کہ پہلے بھی طلبہ اپنے مطالبات منواتے رہے ہیں۔ انہوں نے شیخ حسینہ واجد کو ایک ہی مشورہ دیا کہ وہ طلبہ کی بات سنیں۔ انہیں لگتا ہے کہ ایسا کرنے سے شیخ حسینہ اس دلدل سے نکل پائیں گی، بصورت دیگر حکومت کو آگے چل کر مشکلات پیش آئیں گی۔

کلکتہ سے تعلق رکھنے والے فری لانس صحافی جینتا باسو کہتے ہیں کہ 'بھارتی شہری کی حیثیت سے اس موضوع پر بات کرنا مشکل ہے کیونکہ کئی طرح کے قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ شیخ حسینہ واجد کی حکومت کو سمجھنا چاہیے کہ ان کے ملک کا شمار دنیا کی تیز ترین معیشتوں میں ہوتا ہے، ان ہنگاموں سے معاشی ترقی متاثر ہوگی۔ یہ سیاسی غیر یقینی کی صورتحال بنگلا عوام کے لیے بھی ٹھیک نہیں۔ شیخ حسینہ کو طلبہ کے مطالبات کو سننا چاہیے کیونکہ پُرامن حالات بنگلا حکومت کے استحکام کے لیے ضروری ہیں'۔

جبکہ کلکتہ سے 'ٹائم آف انڈیا' کے شائع کیے جانے والے بنگالی اخبار کے بیورو ہیڈ امل سرکار کہتے ہیں کہ بنگلا دیش میں اس وقت ہنگامے ضرور ہو رہے ہیں لیکن حکومت اس مسئلے سے نکل آئے گی کیونکہ انہیں طاقتور طبقہ کی مدد حاصل ہے۔

## اختلافی آواز دبانے کی کوششیں

۱۵ر سال سے عوامی لیگ کی وزیراعظم ۷۷ سالہ شیخ حسینہ کی حکومت کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مخالفین کے لیے ایک خوف کی فضا پیدا کی ہے اور اپنے خلاف اٹھنے والی تمام آوازوں کو دبانے کی کوشش کی ہے۔ لوگوں کے اغوا اور ہلاکتوں کی خبریں اکثر سامنے آتی رہتی ہیں۔ جبکہ ان کی حکومت پر کرپشن کے الزامات بھی عائد کیے جاتے ہیں۔ وزیراعظم کے سابق اردلی کے اکاؤنٹ میں ۴۰۰ کروڑ کی موجودگی بھی خوب خبروں میں رہی۔

حالیہ صورتحال یہ ہے کہ مقامی افراد ان ہنگاموں پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں، یہاں تک کہ بیرونِ ملک مقیم بنگلا دیش کے شہری بھی کھل کر اظہارِ رائے نہیں کر رہے کیونکہ وہ موجودہ حکومت سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں وہ بھی حکومت کی نظروں میں نہ آ جائیں اور ان پر زمین تنگ ہو جائے۔

ان فسادات میں انسانی جانوں کے نقصان پر حزب اختلاف بنگلا نیشنل پارٹی (بی این پی) نے کھل حکومت پر تنقید کی۔ آخری مصدقہ اطلاعات کے مطابق ۵۰۰ سے زائد افراد گرفتار ہو چکے ہیں۔ جن میں عام طلبہ، ان کے والدین کے ساتھ ساتھ بی این پی اور جماعت اسلامی کے رہنما بھی شامل ہیں۔

## مقامی لوگ کیا کہتے ہیں؟

ناہید اسلام طلبہ تحریک کی رکن ہیں۔ انہوں نے فیس بک پر ایک پوسٹ شیئر کی کہ جس میں انہوں نے حکومت کو ۴۸ گھنٹے دیے ہیں کہ وہ مذاکرات کی میز پر تب ہی آئیں گے جب طلبہ کی لاشوں کو انصاف مل جائے گا۔ مطالبہ رکھا کہ پولیس طلبہ کا ساتھ دے۔ تعلیمی ادارے کھولے جائیں اور انٹرنیٹ اور رابطہ سڑکیں بحال کی جائیں۔ حکومت نے عدالت اور پولیس کو طلبہ کے خلاف استعمال کیا ہے۔

ایک اور طالب علم عبداللہ قادر نے بھی کہا کہ مذاکرات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وزیراعظم شہید طلبہ کے اہل خانہ سے معذرت نہیں کرتیں۔

بنگلا دیش کے شہر چٹا گانگ سے تعلق رکھنے والے صحافی ایوب مہزی کا تعلق بنگلا زبان کے اخبار ''جنوبانی'' سے ہے۔ ان سے ہمارا آخری رابطہ ۱۸ر جولائی کو ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'موجودہ حکومت نے طلبہ کے ساتھ تعصّبانہ رویہ اپنایا اور ان کی بات نہیں سنی گئی جس کی وجہ سے پورے ملک میں فسادات پھیلے اور بڑی تعداد میں اموات ہوئیں۔

طلبہ کا مطالبہ تھا کہ کوٹہ مکمل طور پر ختم کیا جائے لیکن حکومت نے معاملہ خود حل کرنے کے بجائے عدلیہ کے ذمہ ڈال دیا۔ حکومت کو عدلیہ اور فوج کی حمایت حاصل رہی ہے۔ طلبہ موجودہ حکومت پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں۔ وہ کوٹہ سسٹم سے مکمل چھٹکارا چاہتے ہیں جبکہ حکومت غیر سیاسی طلبہ مظاہروں کو پُرتشدد ہنگاموں میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے، وہ طلبہ کو اپنے بنیادی مطالبے سے بھٹکانا چاہتی ہے'۔

پاکستانی طالب علم محمد طاہر کہتے ہیں کہ 'طلبہ تنظیم یہاں کبھی ناکام نہیں ہوئیں۔ اردو زبان کا مسئلہ ہو یا بنگلا دیش کی آزادی، ہم دیکھتے ہیں کہ ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبہ متحرک رہے ہیں۔

یہاں تک کہ مارشل لا اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بھی طلبہ سماجی حقوق کے لیے آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ کئی سالوں بعد اتنے بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے جارہے ہیں جس میں عام طلبہ ہی نہیں بلکہ ان کے والدین بھی شریک ہیں'۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ ۱۵/جولائی کو مظاہرین اور عوامی لیگ کی چھاترا تنظیم کے درمیان کیمپس میں ہنگامے شروع ہوئے اور ۱۸/جولائی تک پورا شہر بند ہو چکا تھا۔ اب تک کتنی اموات ہو چکی ہیں، حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

## طلبہ تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

ڈاکٹر شائستہ تبسم کے خیال میں شیخ حسینہ اس ہنگامی کیفیت سے بھی نکل آئیں گی کیونکہ وہ ہر مخالف آواز کو دبانے کے لیے تیار ہیں۔ 'میڈیا پر جو کچھ دکھایا جارہا ہے وہ بہت کم ہے۔ اموات اور زخمیوں کی تعداد اس سے کئی زیادہ ہے۔ بھارت اور فوج عوامی لیگ کے ساتھ ہیں لیکن اگر انسانی حقوق پر آواز بلند کرنے والے ممالک سامنے نہیں آئے تو حکومتی سطح پر پھیلائی جانے والی دہشت کو مزید ہوا ملے گی۔ عوامی لیگ پر دباؤ بڑھانے کی ضرورت ہے۔ میڈیا پر پابندی اور انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر ہونے والی پامالی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔

'حکومت کو اگر وقتی کامیابی مل بھی جائے گی تو مخالفت اب اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ عوام پھر سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے شروع ہونے والے احتجاج نے اب پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مخالفت تیزی سے پھیل رہی ہے لیکن اس مخالفت کو آگے لے کر جانے کے لیے کوئی رہنما نہیں۔ ہلاکتیں بڑھنے سے احتجاج بڑھے گا کیونکہ عام آدمی مشتعل ہو کر باہر آئیں گے۔ سیاسی سوچ یہی نظر آرہی ہے اگر انہوں نے کھل کر عوام کا ساتھ دیا تو پھر انہیں شیخ حسینہ کے غضب کا سامنا کرنا پڑے گا'۔

## طلبہ کی طرف سے ۹ نکات سامنے آئے ہیں:

☆ وزیراعظم ان فسادات کی ذمہ داری قبول کریں اور عوامی سطح پر ہلاک طلبہ سے معافی مانگیں۔

☆ وزیر داخلہ اور وزیر ٹرانسپورٹ وزارت اور عوامی لیگ سے مستعفی ہوں۔

☆ اموات والے مقامات پر تعینات پولیس اہلکار بھی مستعفی ہوں۔

☆ ڈھاکا، جہانگیر نگر اور راج شاہی یونیورسٹیز کے وائس چانسلر مستعفی ہوں۔

☆ طلبہ پر حملہ کرنے والے تمام غنڈوں کو گرفتار کیا جائے۔

☆ زخمی اور مرنے والوں کو معاوضہ ادا کیا جائے۔

☆ عوامی لیگ کی طلبہ تنظیم بنگلا چھاترا لیگ پر پابندی لگائی جائے۔

☆ تعلیمی ادارے، طلبہ ہوسٹل اور ہال دوبارہ کھولے جائیں۔

☆ طلبہ کو ضمانت دی جائے کہ ان کے خلاف انتقامی کارروائیاں نہیں کی جائیں گی۔

تعلیم کی سرگرمیاں معمول کے مطابق بحال کی جائیں۔

## بنگلا دیش میں موجود پاکستانیوں کی صورتحال

بنگلا دیش میں موجود پاکستانی سفارت خانے سے ہمارا رابطہ ۱۸/جولائی کو ہوا تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ وہ ہمارے سوالات کا جواب دیں گے لیکن انٹرنیٹ بند کر دیا گیا اور مواصلاتی رابطے منقطع ہوگئے لیکن ۲۴ جولائی کی رات کو پاکستان ہائی کمیشن سے دوبارہ رابطہ بحال ہوا اور ڈھاکا میں مقیم ڈپٹی ہائی کمیشن قمر عباس کھوکھر کا جواب ''ڈان اردو ڈیجیٹل'' کو موصول ہوا۔

انہوں نے بتایا کہ یہاں پچھلے ۵ دنوں سے انٹرنیٹ بند تھا۔ پچھلے چند دن کافی پریشان کن تھے، ان ہنگاموں میں درجنوں افراد اپنی جانوں سے جاچکے ہیں جبکہ اس سے کئی گناہ زیادہ افراد زخمی ہیں۔ امید ہے کہ اب حالات بہتر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے بتایا کہ تمام پاکستانی محفوظ ہیں۔ ڈھاکا میں مقیم پاکستانی طلبہ کو پاکستان ہائی کمیشن لایا گیا تھا جبکہ دیگر شہروں میں مقیم طلبہ کو اپنے ہوسٹلز میں رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ رابطے بحال ہونا شروع ہو چکے ہیں۔

پاکستانی دفتر خارجہ کی ترجمان ممتاز زہرہ بلوچ نے ڈان نیوز کو بتایا کہ ہم پاکستانی طلبہ اور بنگلا دیش میں موجود پاکستانیوں سے رابطے میں ہیں۔ انہیں ہوسٹل میں رہنے، ہنگاموں سے دور رہنے کا مشورہ اور سفارت خانے سے رابطے میں رہنے کی ہدایت دی گئی ہے تاکہ کسی ہنگامی صورتحال میں انہیں فوری مدد فراہم کی جاسکے۔ ہم خود بھی وہاں کے حالات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

دنیا کی تیز ترین ترقی کرنے والی معیشتوں میں شمار کیے جانے والے ملک کو اسی کی اپنی حکومت نے ہی پٹڑی سے اتارا تو اب کیا وہ ایک بار پھر اسے پٹڑی پر واپس لانے میں کامیاب ہو سکے گی؟ ۵ بار بنگلا دیش کی وزیراعظم بننے والی شیخ حسینہ کا یہ مسلسل چوتھا دورِ حکومت ہے۔ وہ ایک تجربہ کار سیاست دان ہیں، اب وقت کا تقاضا ہے کہ وہ سیاسی شعور کا مظاہرہ کریں۔

(بحوالہ: ''ڈان نیوز ڈاٹ ٹی وی''۔ ۲۵ جولائی ۲۰۲۴ء)

## ڈرون ٹیکنالوجی: روس۔ یوکرین جنگ کی شکل کیسے بدلی؟

سرگے مورفینوف

دنیا کی عسکری تاریخ میں متعدد ہتھیار بنائے جاتے رہے ہیں اور اس کے بعد ان کا توڑ ڈھونڈنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ نئے ہتھیار اور جنگی حکمت عملی کے سبب فریقین کو میدانِ جنگ میں کامیابیاں ملتی رہی ہیں۔

سلطنت روم میں بنائے گئے خنجروں، نیزوں اور منگولیا اور یورپ میں بنائے گئے تیر کمان جیسے ہتھیاروں نے ان کمانڈروں کو صدیوں تک جیت بخشی ہے جو انھیں استعمال کرنا جانتے تھے۔ تاہم بعد میں ان ہتھیاروں کو غیر مؤثر کرنے کے لیے بھی متعدد ہتھیار بنا لیے گئے۔ روس کے حامی گروہوں نے یوکرین میں ڈرون کا استعمال ۲۰۱۴ء میں ہی شروع کر دیا تھا اور پھر روس کی یوکرین پر چڑھائی کے بعد جاسوسی اور حملوں کے لیے بھی ان ڈرونز کا استعمال کیا گیا جس سے جنگ کی جارحانہ اور دفاعی شکل ہی تبدیل ہوگئی۔

اسی کے سبب ان ڈرونز کو غیر مؤثر کرنے کے لیے دیگر ہتھیاروں کی تلاش شروع ہوگئی جو اب بھی جاری ہے۔ اس سمت میں پہلا قدم ایک ایسا ڈرون کش ہتھیار بنانے کی کوشش ہے جس میں جال پھینکنے کی صلاحیت ہو۔

ڈرون کو غیر مؤثر بنانے والے ہتھیار پر تبصرہ کرتے ہوئے خودکار فائٹر ٹریننگ سسٹم بنانے کے ماہر پاولو لومیئر نے کہا کہ 'گرڈ ایک بڑا تباہ شدہ علاقہ ہے جہاں ہتھیار کے چوکنے کی گنجائش کم ہوتی ہے۔' اگر گرڈ کے کونوں پر وزن بڑھا دیا جائے تو یہ اپنے ہدف کو فضا میں ہی اپنے جال میں پھنسا سکتا ہے اور یہ پروپلر ڈرون کو قابو کرنے کے لیے ضروری بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'نیٹ یا جال پھینکنے والے ہتھیار کی ظاہری کمزوری یہ ہے کہ رینج کم ہوگی کیونکہ اسے تیز ہواؤں کا سامنا بھی ہوگا جس کی سبب اس کی رفتار کم ہو جائے گی۔ ہوا کے اثر کو کم کرنے کے لیے پتلے جال تیار کرنے ہوں گے۔ ہم نے سب سے پہلے یہ آئیڈیا سوچا تھا لیکن جب ہم اس پر ہنس رہے تھے اس وقت دشمن نے اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا'۔

انھوں نے مزید کہا کہ 'روسی نیٹ شوٹر ڈرا پر سائیڈوں سے وزنی دھات بھی فائر کرتے ہیں جو کہ کشش ثقل کا استعمال کرتے ہوئے نیچے گرتے ہیں۔ یہ کم فاصلے کے لیے بنائے گئے ہیں اور اسی سبب یہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں'۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۴/جولائی ۲۰۲۴ء)

# فلسطینی مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی غیر قانونی موجودگی!

اقوامِ متحدہ کی اعلیٰ ترین عدالت نے فلسطینی مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی موجودگی کو 'خلافِ قانون' قرار دیتے ہوئے اسے ختم کرنے کا کہا ہے۔

۱۹ر جولائی کو جاری کی گئی اپنی مشاورتی رائے میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف (آئی سی جے) نے مغربی کنارے میں اسرائیلی آبادکاری، مشرقی بیت المقدس کے الحاق، اس کی زمین پر مستقل کنٹرول اور فلسطینیوں کے خلاف امتیازی قوانین کی نشاندہی بھی کی ہے۔

عالمی عدالت انصاف کی اس مشاورتی رائے پر عملدرآمد لازم نہیں تاہم اس کی رائے بین الاقوامی قانون اور اسرائیل کے قبضے سے متعلق واضح مؤقف کی وجہ سے وزن رکھتی ہے اور عالمی سطح پر اسرائیل کی حمایت کو کمزور بھی کرسکتی ہے۔

فلسطینی صدر محمود عباس کے دفتر نے عدالت کے فیصلے کو ''انصاف کی فتح'' قرار دیا ہے۔ لیکن اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو، جنھوں نے مقبوضہ مغربی کنارے میں یہودی بستیوں کی ایک بڑی توسیع کی نگرانی کی ہے، کہا کہ ''یہودی افراد خود اپنی سرزمین پر قبضہ کرنے والے نہیں ہیں''۔

فلسطینی علاقوں پر اسرائیلی قبضے سے متعلق یہ معاملہ گزشتہ برس اکتوبر میں حماس کے اسرائیل پر حملے کے بعد شروع ہونے والی لڑائی سے بہت پہلے عالمی عدالت کے سامنے لایا گیا تھا۔ سال ۲۰۲۲ء کے اواخر میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے مشرقی یروشلم میں فلسطینی علاقوں پر اسرائیل کے 'قبضے، آباد کاری اور الحاق' جیسے اقدامات پر عالمی عدالتِ انصاف سے رائے طلب کی تھی۔

اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد مغربی کنارے، غزہ اور مشرقی یروشلم کے علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ بعدازاں اسرائیل نے مغربی کنارے پر آبادکاری شروع کردی تھی اور اس میں تیزی سے اضافہ جاری رکھا۔ یہ وہ علاقے ہیں جنھیں فلسطینی اپنی آزاد ریاست کا حصہ قرار دیتے ہیں۔

دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ججوں پر مشتمل ۱۵ر رکنی پینل نے اپنی رائے میں کہا ہے کہ اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں پر مستقل کنٹرول نافذ کرنے اور آبادیاں تعمیر کرکے مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم میں بطور قابض قوت اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کیا ہے۔

پینل نے اسرائیل پر زور دیا ہے کہ وہ فوری طور پر آبادیوں کی تعمیر کا کام روک دے۔ مشاورتی رائے میں کہا گیا ہے کہ مقبوضہ فلسطینی علاقے میں اسرائیل کی موجودگی خلافِ قانون ہے اور اسے جاری رکھنا 'غیر قانونی' ہے جسے 'جتنا جلد ہوسکے' ختم ہونا چاہیے۔

اسرائیل اقوامِ متحدہ اور آئی سی جے پر اپنے خلاف جانبدرانہ رویہ برتنے کا الزام عائد کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے فلسطینی علاقوں سے متعلق معاملے پر آئی سی جے کی کسی سماعت میں شرکت نہیں کی تھی۔

تاہم اپنے ایک تحریری بیان میں اسرائیل نے مؤقف اختیار کیا کہ اس معاملے پر کوئی بھی مشاورتی رائے اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان جاری تنازع حل کرنے کی کوششوں کے لیے 'نقصان دہ' ثابت ہوگی۔ آئی سی جے کی عدالت کے صدر نواف سلام نے مشاورتی رائے پڑھتے ہوئے کہا ''مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم میں اسرائیل کی جانب سے آبادکاروں کی منتقلی اور انہیں وہاں برقرار رکھنا چوتھے جنیوا کنونشن کے آرٹیکل ۴۹ کی خلاف ورزی ہے''۔

عدالت نے اس بات پر بھی 'گہری تشویش' کا اظہار کیا ہے کہ اسرائیل کی آبادکاری کی پالیسی کا دائرہ مسلسل پھیلتا جارہا ہے۔

آئی سی جے نے یہ بھی قرار دیا ہے کہ بطور قابض قوت اسرائیل کی جانب سے مقبوضہ علاقوں کے قدرتی وسائل کا استعمال بھی بین الاقوامی قوانین سے 'غیر ہم آہنگ' ہے۔

یہ مشاورتی رائے ایسے حالات میں سامنے آئی ہے جب اسرائیل پر حماس کے حملے سے شروع ہونے والی جنگ کو ۹ ماہ سے زائد ہوچکے ہیں۔ ایک علیحدہ مقدمے میں آئی سی جے جنوبی افریقا کے ان دعوؤں کا جائزہ لے رہی ہے کہ غزہ میں جاری اسرائیلی کارروائیاں نسل کُشی کا درجہ رکھتی ہیں۔ تاہم اسرائیل ان الزامات کی تردید کرتا ہے۔

آئی سی جے میں فلسطینی مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی موجودگی سے متعلق معاملہ غزہ میں جاری جنگ سے پہلے شروع ہوا تھا اور اس کا حالیہ تنازع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فلسطینی علاقوں سے متعلق جنرل اسمبلی کے عالمی عدالت سے رجوع کرنے کے بعد رواں برس فروری میں ۵۰ ممالک نے بین الاقوامی عدالتِ انصاف میں اپنا مؤقف پیش کیا تھا۔

اس کے علاوہ فلسطینی نمائندے نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ اسرائیل کو فوری طور پر تمام مقبوضہ علاقے خالی کردینے چاہئیں اور وہاں قائم اپنی غیر قانونی آبادیاں بھی ختم کردینی چاہئیں۔ آئی سی جے میں اپنا مؤقف پیش کرنے والے زیادہ تر ممالک نے عدالت سے کہا تھا کہ وہ اسرائیلی قبضے کو غیر قانونی قرار دے جبکہ کینیڈا اور برطانیہ سمیت چند ممالک نے عدالت کو اس معاملے کی سماعت نہ کرنے کا کہا تھا۔

اسرائیل کے سب سے قریبی اتحادی امریکا نے عدالت پر زور دیا تھا کہ وہ مشاورتی رائے کا دائرہ محدود رکھے اور فلسطینی علاقوں سے اسرائیلی افواج کے غیر مشروط انخلا کے احکامات نہ دے۔

اس سے قبل ۲۰۰۴ء میں آئی سی جے نے مغربی کنارے میں اسرائیل کی جانب سے لگائے بیریئرز کو بین الاقوامی قوانین کے منافی اور مغربی کنارے میں اسرائیلی آبادکاری کو عالمی قوانین کی خلاف ورزی قرار دیا تھا۔ تاہم اسرائیل نے اس رولنگ کو مسترد کردیا تھا۔

(بحوالہ: ''اردو وائس آف امریکا ڈاٹ کام''۔ ۱۹ر جولائی ۲۰۲۴ء)


اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ نئی کتاب

اکیڈمی بک سینٹر، D-35، بلاک-5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

# ڈھابوں کی مذہبی پہچان اور بی جے پی کا خوف

آس محمد

دہلی سے ۱۱۰ کلومیٹر دور مظفرنگر ضلع کے میراپور سے ہری دوار جانے والی دلی۔ پوڑی شاہراہ پر لکی شدھ بھوجنالیہ کے سامنے ۴۶ سالہ اروند شرما ایک ڈھابہ مالک گلشاد سے کانوڑ یاترا کے دوران ۱۰ر سے ۱۲ر دن تک ڈھابہ بند رہنے کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔ اروند شرما سیلزمین ہیں۔ وہ ان ڈھابوں کو اشیائے خوردونوش سپلائی کرتے ہیں۔ اروند بتاتے ہیں کہ ان کے ۶ ڈھابہ مالک گاہک مسلمان ہیں۔ ان کے ڈھابہ بند رہنے سے ان کے کاروبار پر اثر پڑے گا۔ نان ویجیٹیرین ڈھابے بند رہتے ہیں تو یہ سمجھ میں آتا ہے، لیکن ویجیٹیرین ڈھابوں کے لیے یہ فیصلہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں تو سب مل جل کر رہتے ہیں۔

اروند شرما کہتے ہیں 'مسلمانوں کا ڈھابہ بند کروانے سے کیا فائدہ ہے؟ جو گوشت بیچ رہے ہیں ان کی دکانیں بند کرانا سمجھ میں آتا ہے، لیکن جو دال، روٹی، نمکین اور کولڈ ڈرنکس بیچ رہے ہیں، ان کی دکانیں کیوں بند کروا رہے ہیں؟ یہ تو غلط بات ہے'۔

شرما کا مزید کہنا ہے کہ ڈھابہ مالکان نے مسلمان ہوتے ہوئے ہندوؤں کا نام رکھ لیا، چلو اس میں ان کی غلطی ہے، انہیں اپنا نام ہی رکھنا چاہیے۔ ان کو مسلم نام لکھنا چاہیے اور اس کے آگے 'شدھ شاکاہاری' لکھنا چاہیے۔ پھر تو کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے'۔ اس وقت اتر پردیش کے مظفرنگر میں ڈھابوں کے نام بدلے جانے کو لے کر کافی چرچہ ہے۔ بتادیں کہ کانوڑ یاترا کے دوران مظفرنگر کی سڑکوں سے تمام کانوڑیے گزرتے ہیں۔

## ڈھابوں کا حال

ڈھابوں میں پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ لکی شدھ بھوجنالیہ ڈھابے کے مالک گلشاد خان کہتے ہیں 'ان کے ۱۸ر ملازمین میں سے ۱۷ر ہندو ہیں۔ اس کے علاوہ دودھ والا، چپس والا سیلزمین، راشن والا دکاندار اور سبزی والا سب ہندو ہیں۔ ڈھابہ بند رہنے کی صورت میں یہ متاثر ہوں گے۔ نام بدلنے سے گاہک نہیں آئیں گے! اس سے سماج میں بٹوارہ ہو رہا ہے'۔

کانوڑ روٹ پر ڈھابوں کے نام بدلنے کی کہانی صرف مظفرنگر تک محدود نہیں ہے بلکہ ہری دوار تک جانے والی ہر سڑک کی یہی کہانی ہے۔ سہارنپور، شاملی، مظفرنگر کے علاوہ دلی پوڑی نیشنل ہائی وے بھی اس کی زد میں ہے۔ سیکڑوں ڈھابہ چلانے والوں اور ہزاروں خاندانوں کا اس سے متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ ریسٹوران کے مالک، شدت پسند ہندو تنظیموں سے جڑے کچھ لیڈر اور اس پورے معاملے کے ماسٹر مائنڈ بگھرا کے ایک آشرم کے یشویر مہاراج اور ان کے کچھ چیلوں کے علاوہ کوئی بھی اس کارروائی سے خوش نہیں ہے۔

غور طلب ہے کہ ایسا صرف تین سالوں سے ہو رہا ہے، جبکہ اتر پردیش میں یوگی آدتیہ ناتھ کی قیادت والی بی جے پی حکومت سات سال سے برسر اقتدار ہے۔ اس بار جتنی تیزی کا مظاہرہ کیا گیا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں کیا گیا۔ ایسے میں ایک بات جو سمجھ میں آتی ہے کہ حالیہ انتخابات میں اس علاقے میں ہونے والی شکست کا غصہ اس کی وجہ ہے۔

## اس کی بنیاد کیسے رکھی گئی؟

مظفرنگر ضلع میں شاملی روڈ پر یشویر مہاراج نامی شخص کا آشرم ہے۔ یشویر مہاراج ہندوتوادی امیج رکھتے ہیں۔ کورونا کے دور کے بعد جب کانوڑ یاترا دوبارہ شروع ہوئی تو یشویر مہاراج نے مظفرنگر پولیس کو ۵۰ سے زائد ڈھابوں کی فہرست پیش کی، جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ شدھ شاکاہاری کا بورڈ لگائے ان ہندو ناموں والے ڈھابوں کے مالکان اصل میں مسلمان ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کانوڑ یاترا کے دوران کانوڑیوں کو دھوکہ ہوتا ہے۔ کانوڑ یاترا کے دوران ان ڈھابوں کو بند کر دینا چاہیے یا پھر انہیں اپنے ڈھابوں پر اپنی پہچان لکھ دینی چاہیے، کیونکہ یہاں کا کھانا کھانے سے کانوڑیوں کا 'دھرم بھرشٹ' ہو جاتا ہے۔

پولیس نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس سے یشویر مہاراج ناراض ہو گئے اور انہوں نے مظفرنگر میں دھرنا دیا۔ جارحانہ تقریریں کی جانے لگیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بگڑنے کے خوف کے درمیان یہ بحث لکھنؤ تک پہنچ گئی۔ ۲۰۲۲ء میں ایسے تمام ڈھابوں کی تصدیق کی گئی تھی۔ ڈھابہ کے مالک اور وہاں کام کرنے والے ملازمین کی فہرست تیار کی گئی۔ ۲۰۲۳ء میں بغیر کسی تحریری حکم کے تمام مسلم مالکان کے ڈھابوں کو بند کرا دیا گیا۔ اس بار اس سے بھی آگے بڑھ کر ۲۳۰ کلومیٹر کانوڑ روٹ پر ہر قسم کی دکانوں کو ان کی پہچان ظاہر کرنے کی ہدایات جاری کی جا رہی ہیں۔ ہندو ڈھابہ مالکان سے کہا گیا ہے کہ وہ مسلمان ملازمین کو چھٹی دیں۔ مسلم ڈھابہ کے مالکان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلم نام رکھیں یا ڈھابہ بند رکھیں۔ مزید یہ کہ روزمرہ کی اشیاء فروخت کرنے والی دکانوں اور میوہ فروشوں سے بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پہچان ظاہر کریں۔ اس پورے واقعہ نے اس علاقے کی سماجی ہم آہنگی کو بگاڑ دیا ہے اور اسے مسلمانوں کے بائیکاٹ کی مہم قرار دیا جا رہا ہے۔

## سماجی، معاشی اور ہم آہنگی کے لیے خطرناک مہم

گزشتہ چند سالوں میں مقامی انتظامیہ نے اس مسلم اکثریتی علاقے میں کانوڑ یاترا کو کامیاب بنانے کے لیے مسلمانوں کا تعاون لیا ہے۔

اس حوالے سے مظفرنگر کا میناکشی چوک کافی چرچے میں رہتا ہے۔ دراصل پچھلے ۱۰ر سالوں سے اس میناکشی چوک پر کانوڑیوں کی خدمت کے لیے کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ مظفر نگر کی کئی تنظیمیں مثلاً پیغامِ انسانیت، آواز حق اور سیکولر فرنٹ ہر سال اسی میناکشی چوک پر بھنڈارے کا اہتمام کرتی ہیں اور میڈیکل کیمپ لگا کر کانوڑیوں کی خدمت کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ شاملی، سہارنپور اور کھتولی میں بھی اسی طرح کے کیمپ لگائے جاتے ہیں جو صرف مسلمان چلاتے ہیں۔ سیکڑوں مسلم نوجوان سماجی کارکن، عوامی نمائندے اور رضاکار کے طور پر انتظامیہ کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ مظفر نگر کے آصف راہی، دلشاد پہلوان، گوہر صدیقی، محبوب علی، ستار منصوری، عمر احمد ایڈوکیٹ ایک دہائی سے زیادہ عرصے سے یہ کام کر رہے ہیں۔

قدوائی نگر کے رہائشی عمر احمد ایڈوکیٹ کہتے ہیں، 'یہ ہم آہنگی کو خراب کرنے کی کوششیں ہیں'۔ عمر بتاتے ہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کانواڑیوں کے پاؤں دبا چکے ہیں۔ ان کی مرہم پٹی کی ہے۔ انہیں پھل اور کھانا کھلایا ہے۔ اب جو ماحول بنایا جا رہا ہے اس میں مسلمانوں کو ولن ثابت کیا جا رہا ہے۔ اب انہیں ڈر ہے کہ ایسی حالت میں اگر برقع یا ٹوپی پہن کر باہر نکل گئے تو کیا ہوگا؟ 'اب تو صرف ایک حکم ہی رہ گیا ہے کہ جب تک کانوڑ یاترا ہو مسلمان گھر سے باہر نہ نکلیں'۔

## مسلمان اور ہندو سماج کے درمیان روزگار کا سنگم

ہری دوار جانے کے لیے سہارنپور، مظفرنگر اور بجنور اہم راستے ہیں۔ اس راستے پر ہزاروں ڈھابے ہیں۔ جن ڈھابوں کے مالک مسلمان ہیں وہاں تمام کارساز (ملازمین) ہندو ہیں اور جن ڈھابوں کے مالک ہندو ہیں وہاں تمام کارساز مسلمان ہیں۔ اس طرح لاکھوں لوگ اس کاروبار سے وابستہ ہیں۔ آج یہ تمام ڈھابہ چلانے والے تناؤ میں ہیں۔ مظفرنگر اور کھتولی میں کچھ ڈھابہ مالکان سے کہا گیا ہے کہ وہ مسلم ملازمین کو چھٹی دیں۔ ڈھابہ مالک اور ان کے ملازمین خود کو بے بس محسوس کر

رہے ہیں کیونکہ ان کے ڈھابہ بند کرنے کا فرمان آ گیا ہے۔

دلی۔پوڑی روڈ پر مظفر نگر ضلع کے میراپور قصبے میں لکی شدھ بھوجنالیہ میں کام کرنے والے پون کمار کا کہنا ہے کہ وہ گزشتہ ۱۸/سالوں سے یہاں باورچی کے طور پر کام کر رہے ہیں۔انہیں اپنے مذہب کی وجہ سے کبھی امتیازی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پون کے چار بچے ہیں۔پون ہر سال کانوڑ یاترا کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں کیونکہ اس میں زیادہ گاہک آتے ہیں۔

پون کہتے ہیں، 'پہلے پولیس صرف ریٹ لسٹ لگانے کے لیے کہا کرتی تھی۔ میرے ڈھابے کا مالک مسلمان ہے اور مجھے ان کے ساتھ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ میں ۱۸/سال سے اسی ڈھابے پر کام کر رہا ہوں۔ ڈھابہ ۱۵/دن بند رہے تو میری مالی حالت خراب ہو جائے گی۔ میرے بچے اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں'۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری سال بھر کی امیدیں ان ۱۵/دنوں پر ٹکی رہتی ہیں۔

پون کمار کا کہنا ہے کہ ڈھابوں پر نام لکھوانا غلط ہے۔کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندو سماج کے لوگ تلک لگا کر بیٹھیں؟ 'ہزاروں ہندو لوگ مسلمانوں کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ ان کی روٹی بھی چھین رہے ہیں، یہ کیسی پالیسی ہے؟ ہم محنت کر کے کماتے ہیں۔بینک کا لون بھی چکانا ہے۔کام بند ہوگا تو پھر قرض لینا پڑے گا'۔

### الیکشن ہارنے کے بعد بی جے پی زہر کا ڈوز بڑھا رہی ہے

اکثر تنازع میں رہنے والے جس یشویر مہاراج کی شکایت پر یہ کارروائی کی جا رہی ہے، وہ ۲۰۱۸ء سے یہ مطالبہ کر رہے تھے۔انہیں جون ۲۰۲۲ء میں دھرنے پر بیٹھنا پڑا۔ برسوں پولیس انتظامیہ نے انہیں نظرانداز کیا تو پھر حالیہ دنوں میں ایسا کیا ہو گیا؟

لوگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس کے پس پردہ خالص سیاست ہے۔سہارنپور ڈویژن سے بی جے پی کا صفایا ہو چکا ہے۔ سہارنپور، کیرانہ اور مظفرنگر لوک سبھا میں اب بی جے پی کا ایم پی نہیں ہے۔ ہری دوار سے ملحق منگلور اسمبلی سیٹ بھی کانگریس نے جیت لی ہے۔میرٹھ میں بی جے پی ہارتے ہارتے بچی ہے۔ ۲۰۱۳ء کے فسادات کے بعد بی جے پی کو جو آکسیجن مغربی اتر پردیش کے اس علاقے سے ملی تھی، وہ ختم ہو گئی ہے۔مظفرنگر کے سینئر وکیل اور سماج وادی پارٹی کے لیڈر پرمود تیاگی کا کہنا ہے کہ 'بھارتیہ جنتا پارٹی کو سماجی تانا بانا مضبوط ہوتے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔یہ الیکشن ہار گئے، انہیں لگتا ہے کہ نفرت کے زہر کا اثر کچھ کم ہو گیا ہے۔اس لیے ڈوز بڑھا رہے ہیں'۔

ایک اور راہنما راکیش شرما کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے میں مسلمانوں کے تئیں ہمدردی پیدا ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں یہاں کے بڑے بڑے ریستوران اور ڈھابہ مالکان نے یہ سازش رچی ہے تاکہ وہ زیادہ منافع کما سکیں۔اس کے لیے انہوں نے مذہب کا سہارا لیا ہے'۔

### پولیس انتظامیہ نے کیا وضاحت پیش کی؟

مظفرنگر کے ایس ایس پی ابھیشیک سنگھ کہہ رہے ہیں کہ ایسا فیصلہ اس لیے لیا گیا ہے تاکہ امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔کانوڑیوں میں کوئی بھرم پیدا نہیں ہونا چاہیے۔کئی بار کھانے پینے کے معاملے میں کانوڑیوں کے ساتھ جھگڑے ہوتے ہیں، نام دیکھ کر بھی کانوڑیے کچھ خریدنے کے خواہش مند ہیں تو پولیس انتظامیہ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔نام لکھوانے کا یہ فیصلہ رضاکارانہ طور پر لیا گیا ہے۔

سہارنپور کے ڈی آئی جی نے بھی ایس ایس پی کی یہی بات دہرائی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ انتظامیہ کی ترجیح کانوڑ یاترا کو محفوظ طریقے سے مکمل کرانا ہے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔۲۰ جولائی ۲۰۲۴ء)

# امریکی انتخابات: جو بائیڈن دستبردار، اب کیا ہوگا؟

امریکی صدر جو بائیڈن نے رواں سال نومبر میں ہونے والے صدارتی انتخابات کی دوڑ سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔امریکی صدر جو بائیڈن نے دوبارہ الیکشن میں حصہ نہ لینے کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'یہ فیصلہ میری پارٹی اور ملک کے بہترین مفاد میں ہے'۔

جو بائیڈن کا یہ اعلان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب امریکا کے صدارتی انتخابات میں چار ماہ رہ گئے ہیں۔ یاد رہے کہ صدر بائیڈن کو انتخابات سے دستبردار ہونے کے لیے چند ہفتوں سے مسلسل دباؤ کا سامنا تھا جس کا آغاز ایک ٹی وی مباحثے سے ہوا جس نے ان کی صحت کے بارے میں خدشات کو جنم دیا۔انتخابات سے دستبرداری کے اعلان کے لیے اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹ پر پوسٹ کیے گئے پیغام میں انہوں نے کہا کہ بطور صدر خدمات انجام دینا ان کی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔

سماجی رابطے کی ویب سائٹ ایکس پر پوسٹ میں ۸۱ سالہ ڈیموکریٹ بائیڈن نے کہا کہ 'صدر کی حیثیت سے آپ کی خدمت کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز رہا ہے'۔

انہوں نے کہا کہ اگرچہ میرا ارادہ دوبارہ انتخاب لڑنے کا رہا ہے لیکن میرا ماننا ہے کہ یہ میری پارٹی اور ملک کے بہترین مفاد میں ہے کہ میں دستبردار ہو جاؤں اور اپنی بقیہ مدت کے لیے صدر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے پر توجہ مرکوز کروں۔ صدر بائیڈن نے کہا کہ وہ اس ہفتے کے آخر میں اپنے فیصلے کے بارے میں قوم سے مزید تفصیل سے بات کریں گے۔

اس اعلان کے بعد صدر بائیڈن نے صدارتی دوڑ کے لئے نائب صدر کملا ہیرس کی حمایت کا اعلان بھی کیا ہے۔

صدر بائیڈن نے اپنی نائب صدر کملا ہیرس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک 'غیر معمولی خاتون' ہیں۔

### اب کیا ہوگا؟

جو بائیڈن اپنی باقی صدارتی مدت مکمل کریں گے لیکن رواں سال صدارتی انتخابات میں امیدوار نہیں ہوں گے۔ان کے اس فیصلے نے ڈیموکریٹک پارٹی کو مشکل میں ڈال دیا ہے جسے اب صرف ایک ماہ کے اندر ریپبلکن پارٹی کے امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا امیدوار چننا ہوگا۔

ماضی میں ۱۹۶۸ء میں امریکی تاریخ میں ایسا ہوا تھا جب صدر لنڈن بی جانسن نے اعلان کیا تھا کہ وہ دوسری بار صدارتی امیدوار نہیں بنیں گے۔

صدر بائیڈن پہلے ہی اپنی جماعت کی نامزدگی حاصل کرنے کے لیے درکار ووٹ حاصل کر چکے تھے۔ایسے میں ان کی جانب سے کملا ہیرس کی نامزدگی موجودہ نائب صدر کو سب سے واضح امیدوار بنا سکتی ہے۔تاہم اب ڈیموکریٹک پارٹی کے پاس ایک نیا امیدوار چننے کا راستہ موجود ہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کنونشن ۱۹/اگست کو شروع ہوگا جس میں یہ بھی ممکن ہے کہ نیا امیدوار سامنے آجائے۔

اگر کسی بھی امیدوار کو تقریباً چار ہزار ڈیلیگیٹس، جو پارٹی کے ہی اراکین ہوتے ہیں، میں سے اکثریت نہیں ملتی تو ایک دوسرا مرحلہ بھی ہو سکتا ہے جس میں سپر ڈیلیگیٹس شامل ہو جائیں گے جو پارٹی رہنما اور منتخب اراکین ہوتے ہیں۔کسی بھی امیدوار کو نامزدگی حاصل کرنے کے لیے ۱۹۷۶ ووٹ درکار ہوں گے۔

بائیڈن کی دستبرداری کے مطالبات کے ساتھ ہی ان کے متبادل کے نام پر بھی غور شروع ہو گیا تھا اور ایسے میں کئی نام سامنے آ چکے ہیں۔مشی گن ریاست کے گورنر گریچن وٹمر کا نام بھی سامنے آیا ہے۔جو بائیڈن کے اعلان کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ ڈونلڈ ٹرمپ کو روکنے کے لیے ہر ممکن کام کریں گی۔

دیگر ممکنہ امیدواروں میں کیلیفورنیا کے گورنر گیون نیوسوم، ٹرانسپورٹیشن کے وفاقی سیکریٹری پیٹ بیٹیگیگ اور پنسلوینیا کے گورنر جوش شپیرو شامل ہیں۔ اگر کملا ہیرس اپنی جماعت کی صدارتی نامزدگی حاصل کرلیتی ہیں تو یہ نام ان کے نائب صدر کے امیدوار بھی ہوسکتے ہیں۔

اس سے قبل امریکی صدر جو بائیڈن نے بطور صدارتی امیدوار ڈیموکریٹس کی تشویش کو دور کرنے کی کوششوں میں اے بی سی نیوز کے پرائم ٹائم انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ صرف خدا ہی انہیں دوبارہ انتخاب میں حصہ لینے کی دوڑ سے باہر نکلنے کے لیے راضی کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی ذہنی استعداد کی جانچ کا امتحان (cognitive test) لینے اور اس کے نتائج کو عوام کے سامنے لانے سے ایک بار پھر انکار کیا تھا۔

۸۱ سالہ جو بائیڈن نے پروگرام کے میزبان جارج سٹیفانو پولس کو بتایا تھا کہ 'میرا ہر ایک دن ایک عملی امتحان ہوتا ہے اور ہر روز میرا (ذہنی استعداد کا) ٹیسٹ ہوتا ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ ایک امتحان ہے'۔ انہوں نے بعض ڈیموکریٹک عہدیداروں اور عطیہ دہندگان کی اس سوچ کو مسترد کیا جنہوں نے گزشتہ دنوں سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ جو بائیڈن کے مباحثے کے بعد انہیں اپنا متبادل سامنے لانے کے لیے دباؤ میں لانا شروع کیا تھا۔

صدر بائیڈن نے گزشتہ ہفتے اپنی خراب کارکردگی کا ذمہ دار تھکن اور بخار کو ٹھہرایا تھا۔ اپنے ۲۲ منٹ کے انٹرویو کے دوران انہوں نے یہ بھی کہا کہ 'مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بھی شخص مجھ سے زیادہ صدر بننے یا جیتنے کا اہل ہے'۔ جو بائیڈن نے اس دوران ڈیموکریٹس کے صدارتی انتخاب کی دوڑ میں میدان کھو دینے کے اندیشوں کو یہ کہہ کر کم کرنے کی کوشش کی کہ اب بھی ان کا ٹرمپ کے ساتھ کانٹے کا مقابلہ ہے۔

جو بائیڈن نے اتحادیوں کی جانب سے صدارتی دوڑ سے باہر نکلنے کی تجاویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ 'ایسا کچھ نہیں ہونے والا'۔ جو بائیڈن نے انتخابی دوڑ سے باہر ہونے پر مجبور کیے جانے سے متعلق سوالات کو بار بار مسترد کیا اور کہا کہ 'اگر خدا خود نیچے (زمین پر) آئے اور کہے کہ اس دوڑ سے باہر ہو جاؤ تو ہی میں دوڑ سے باہر ہوں گا۔ اور خدا یہ کہنے نیچے نہیں آیا'۔

جو بائیڈن چند دنوں سے زور و شور سے اپنے اس اعتماد کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جسے ریپبلکن حریف ڈونلڈ ٹرمپ سے بحث کے بعد وہ کھو رہے تھے۔

نیویارک میں سابق صدر ٹرمپ کی سزا اور دوسرے الزامات کا حوالہ دیتے ہوئے بائیڈن نے اپنے حریف کو 'ایک ہی فرد کے جرائم کا تسلسل' قرار دیا تھا۔ امریکی صدر جو بائیڈن نے چند روز قبل اقرار کیا تھا کہ انہوں نے ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ صدارتی مباحثے کے دوران بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے حامیوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ صدارتی دوڑ کا حصہ رہیں گے۔

انہوں نے وسکونسن کے ریڈیو سے بات کرتے ہوئے مباحثے کے دوران اپنی کارکردگی کو 'ایک غلطی' قرار دیا تھا تاہم انہوں نے ووٹروں پر زور دیا کہ وہ انہیں ووٹ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ وائٹ ہاؤس میں گزاری ان کی صدارتی مدت کے مطابق کریں۔

## ٹرمپ۔ بائیڈن صدارتی مباحثے میں کیا ہوا؟

اگرچہ کچھ عرصے سے بہت سے امریکیوں کو صدر جو بائیڈن کی عمر اور ان کی صحت کے بارے میں بہت سے خدشات لاحق تھے تاہم سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ ہونے والے مباحثے نے ان خدشات کو ختم کرنے کے بجائے مزید تقویت بخش دی تھی۔

۲۷ جون کی شام ہونے وال صدارتی مباحثے میں صدر بائیڈن ایک واضح اور آسان ہدف کے ساتھ داخل ہوئے تھے تاہم وہ اپنے کسی بھی ہدف کو حاصل کرنے میں ناکام نظر آئے۔ پوری بحث کے دوران وہ ہچکچاہٹ کا شکار دکھائی دیے اور ان کی باتیں بھی مبہم تھیں۔

بحث کے دوران بائیڈن کی ٹیم نے صحافیوں کو بتایا کہ صدر زکام کا شکار ہیں جس کی وجہ سے ان کی آواز خراب اور مبہم سنائی دے رہی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو بھی لیکن بظاہر یہ ایک بہانہ لگ رہا تھا۔ تقریباً ۹۰ منٹ تک جاری رہنے والے مباحثے کے دوران مسلسل ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے جو بائیڈن اپنی باتوں پر قابو نہیں رکھ پا رہے تھے۔ ان کی جانب سے دیے جانے والے کچھ جوابات تو انتہائی بے تکے تھے۔

مباحثے کے دوران ایک سوال کا جواب انہوں نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ 'ہم نے آخر کار میڈی کیئر کو ہرا دیا'۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے میڈی کیئر امریکی حکومت کے زیر انتظام بزرگوں کی صحت کی دیکھ بھال کا پروگرام ہے۔

اس مباحثے کے فوراً بعد جو بائیڈن کی سابقہ کمیونیکیشن ڈائریکٹر کیٹ بیڈنگ فیلڈ سی این این پر موجود تھیں۔ انہوں نے صاف الفاظوں میں اس بات کا اعتراف کیا کہ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ بحث کسی بھی صورت جو بائیڈن کے لیے مثبت ثابت نہیں ہوئی۔ ان کے مطابق جو بائیڈن کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ثابت کرنا تھا کہ بطورِ صدر کام کرنے کے لیے ان میں نہ صرف توانائی ہے بلکہ وہ صحت مند بھی ہیں لیکن بائیڈن ایسا کرنے میں ناکام رہے۔

جیسے جیسے بحث آگے بڑھی، اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کی کوشش میں کسی شکست خوردہ باکسر کی طرح جو بائیڈن نے بھی کھیل کی رفتار میں تبدیلی لانے کی کوشش کی اور اپنے حریف پر تیزی سے وار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ وار تو اپنے ہدف پر لگے جنہوں نے شاید سابق صدر کو غصہ بھی دلا دیا۔ ٹرمپ نے بائیڈن کے ایک اور جواب کے بعد طنز کرتے ہوئے کہا کہ 'مجھے نہیں سمجھ آئی کہ انہوں نے اس جملے کے آخر میں کیا کہا ہے، اور میرے خیال میں شاید یہ خود بھی نہیں جانتے'۔

دوسری جانب بحث کے دوران سابق صدر ٹرمپ بڑی حد تک نظم وضبط کے ساتھ کارکردگی دکھانے میں کامیاب رہے اور انہوں نے ایسے کسی بھی موضوع میں پڑنے سے اجتناب کیا جس سے بحث پٹڑی سے اتر سکتی تھی جیسا ان کے ساتھ ۲۰۲۰ میں ہونے والے مباحثوں کے دوران ہوا۔

ٹرمپ کافی حد تک تمام گفتگو کو صدر بائیڈن کے ریکارڈ پر مرکوز رکھنے میں کامیاب رہے۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''۔ ۴ جولائی ۲۰۲۴ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

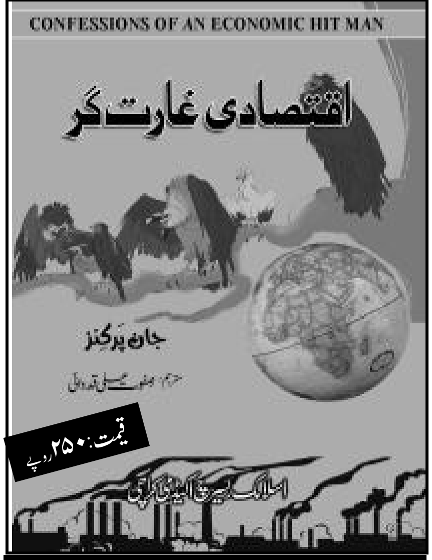


اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک-5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

# زخمی ٹرمپ کی تصویر امریکی انتخابات کا رخ بدلے گی؟

**جان سوپل**

یہ وہ تصویر ہے جو پوری دنیا میں دیکھی گئی۔ اس تصویر کو امریکا کی آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی۔ اس تصویر میں ڈونلڈ ٹرمپ چہرہ خون آلود ہونے کے باوجود اپنی جگہ قائم دکھائی دے رہے ہیں۔ امریکی خفیہ سروس کے افسروں نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان کے منہ سے بار بار 'لڑائی' کا لفظ نکل رہا ہے جبکہ افسروں نے انہیں حفاظتی تحویل میں لے لیا۔

اس تصویر نے مجھے دوسری عالمی جنگ کی شاید سب سے مشہور تصویر کی یاد دلا دی جب امریکی میرین کور نے بحرالکاہل میں واقع جزیرے ایوو جیما میں امریکی پرچم لہرایا۔ گزشتہ رات ڈونلڈ ٹرمپ پرچم کی طرح تھے جنہیں سکیورٹی تقریباً بزور بازو اپنے ساتھ لے گئی۔

سابق صدر محفوظ رہے لیکن اگر گولی مزید ایک یا دو انچ دائیں جانب ہوتی تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ سیاسی تشدد کے ایک اور واقعے کے بارے میں سن کر واقعی مایوسی ہوتی ہے۔ ایک واقعہ جس کی تاریخ بذات خود جمہوریہ کے آغاز تک جاتی ہے۔

جان ولکس بوتھ، چارلس جے گوئیٹو، لی ہاروی اوسوالڈ اور جان ہنکلی جونیئر جیسے ناموں پر مشتمل اس فہرست میں اب ہم تھامس میتھیو کروکس کو بھی شامل کر سکتے ہیں، جو کسی موجودہ یا سابق امریکی صدر کی زندگی پر حملہ کرنے کی کوشش کرنے والے تازہ ترین شخص ہیں۔

تھامس میتھیو کروس کے مقصد کے بارے میں کچھ معلوم ہونا بہت قبل از وقت ہے۔ وہ رجسٹر ریپبلکن تھے لیکن انہوں نے ترقی پسندانہ مقاصد کے لیے بھی چندہ دیا۔

بوتھ نے لنکن کو سیاست اور غلامی کے خاتمے پر آنے والے غصے کی وجہ سے قتل کیا۔ اوسوالڈ نے ڈیلس میں جے ایف کینیڈی کو اس طرح سے گولی ماری جس نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا، جس سے واقعی کیا ہوا کہ اس کے بارے میں بہت سے سازشی نظریات پیدا ہوئے۔ ہنکلی نے ریگن کو مارنے کی کوشش کی کیونکہ وہ جوڈی فوسٹر کو متاثر کرنا چاہتے تھے، جس سے وہ محبت کرتے تھے۔

قتل کی ان تمام کوششوں، خواہ وہ کامیاب ہوں یا ناکام، میں جو قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ طاقتور اسلحہ آسانی کے ساتھ دستیاب ہے، جس کی مدد سے اپنے منتخب کردہ 'ہدف' کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پنسلوینیا میں ماگا (میک امریکا گریٹ اگین) ہجوم ہتھیار رکھنے کے حق کی بھرپور حمایت کر رہا ہے اور اسے سانس لینے کے حق کی طرح بنیادی حق سمجھا جاتا ہے۔

۲۰۲۰ء کی انتخابی مہم کے اختتام پر پنسلوینیا میں ہونے والی ٹرمپ کی آخری ریلی تھی جس میں، میں نے شرکت کی۔ یہ ریلی سکرنٹن میں ہوائی اڈے کے قریب ہو رہی تھی۔ ان ریلیوں کی سکیورٹی اس سے کہیں زیادہ سخت ہوتی ہے، جو آپ عام طور پر برطانیہ میں دیکھتے ہیں۔

پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا جاتا ہے اور آپ کے اسٹیج کے قریب جانے سے پہلے میٹل ڈیٹیکٹرز اور چھڑیوں کی مدد سے ہوائی اڈے کی طرز کی سکیورٹی ہوتی ہے۔ امریکی سیکرٹ سروس کے پاس کسی بھی ایسی قریبی عمارت کو بند کرنے کا کافی اختیار ہوتا ہے، جو خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹرمپ پر حملہ کرنے والا قریبی فیکٹری کی چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس حوالے سے سکیورٹی کے سنجیدہ سوالات کا جواب دینا باقی ہے۔

اس واقعے کا نتیجہ تشویش ناک ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ جو بائیڈن نے فوری طور پر اپنے مخالف پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی مذمت کی۔ انہوں نے ایسی بات کی جو مثبت ہے، تاہم بائیڈن کا یہ کہنا کہ اس طرح کے سیاسی تشدد کے بارے میں کبھی 'نہیں سنا گیا' بالکل درست نہیں۔

آیئے اس منظر کو یاد کرتے ہیں جب ٹرمپ 'لڑائی' کا لفظ دہراتے رہے۔ اس وقت جب حفاظتی نکتہ نظر سے انہیں دور لے جایا گیا۔ کیا امریکا کو اس وقت لڑائی کی واقعی زیادہ ضرورت ہے؟ ہم پہلے ہی صدارتی الیکشن کے بعد چھ جنوری کے بلوے کے دوران سیاسی تشدد دیکھ چکے ہیں۔

کسی بھی دوسرے مقابلے کی طرح سیاست میں 'لڑائی' کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن لڑائی کے لفظ کو حکم کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے چھ جنوری کو دیکھا، 'اوتھ کیپرز' اور 'پراؤڈ بوائز' جیسے گروپوں کی موجودگی میں امریکا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں اس سمت میں زیادہ حوصلہ افزائی کی ضرورت نہیں ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ چھ جنوری کے واقعات کی تحقیقات کے دوران دیے گئے شواہد کے مطابق ٹرمپ نے سیکرٹ سروس کے ساتھ اس بات پر جھگڑا کیا تھا کہ وائٹ ہاؤس کے جنوب میں واقع ایلپس نامی علاقے میں کس کو داخل ہونے کی اجازت ملے، جہاں ٹرمپ نے اپنے حامیوں پر زور دیا تھا کہ وہ امریکی کانگریس کی عمارت میں داخل ہو کر ملک کی خاطر 'بھرپور لڑائی' لڑیں۔

(بحوالہ: "انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام"۔ ۱۶ جولائی ۲۰۲۴ء)

# امریکا نازک ترین سیاسی موڑ پر

محمد ابراہیم خان

ایسا لگتا ہے امریکی سیاست انتہائی غیر متوقع طور پر بند گلی میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ چند ماہ کے دوران امریکی سیاست میں عجیب وغریب واقعات رونما ہوئے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاملات صرف اور صرف پیچیدگیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ پالیسیوں میں عدم توازن نمایاں ہو چلا ہے۔ حکمتِ عملی کی سطح پر بھی الجھنیں ایسی نہیں کہ دکھائی نہ دیں اور سمجھ میں نہ آسکیں۔

غیر یقینی کیفیت تو بہت سے ممالک کی سیاست میں ہے۔ فرانس میں کیا سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے؟ بالکل نہیں۔ برطانیہ میں کیا کوئی گڑبڑ نہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ اٹلی، جرمنی، یونان، اسپین ......کہیں بھی سب کچھ اچھا نہیں چل رہا ہے۔ سرکاری اور نجی دونوں ہی میڈیا آؤٹ لیٹ صاف صاف بتا رہے ہیں کہ خرابیاں ہیں اور بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔

فرانس، جرمنی اور چند دوسرے بڑے یورپی ممالک میں انتہائی دائیں بازو کی یعنی خالص قوم پرستانہ نظریے کی تنگ نظری والی سیاست تیزی سے ابھر رہی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں سبھی اپنے اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے کی کوششوں میں جُتے ہوئے ہیں۔ یورپ مجموعی طور پر الگ تھلگ سا ہو گیا ہے۔ امریکا کا ساتھ نبھاتے نبھاتے وہ دنیا بھر میں اپنے دشمنوں کی تعداد میں پریشان کن حد تک اضافہ کر چکا ہے۔ یورپی قائدین پہلے مرحلے میں تو امریکا سے الگ ہو کر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسرے مرحلے میں وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے ہاں افریقا، ایشیا، مشرقِ بعید اور جنوبی امریکا وغیرہ سے زیادہ لوگ یعنی تارکینِ وطن نہ آئیں۔ اس کے لیے پالیسیاں بھی تبدیل کی جا رہی ہیں اور حکمتِ عملی میں بھی کچھ الگ سے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ یورپ کی الجھن سمجھی نہ جاسکے۔ روس نے یوکرین پر جنگ مسلط کر کے پورے یورپ کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ فرانس، برطانیہ اور جرمنی میں اس حوالے سے اختلافِ رائے نمایاں ہے۔ یورپی ممالک یوکرین کی مدد ضرور کرتے آئے ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ یوکرین ٹِک نہیں پا رہا اور روس دم لینے کو تیار نہیں۔ یوکرین کہتا ہے کہ وہ جنگ ہار گیا تو پورا یورپ داؤ پر لگ جائے گا۔ یوکرین اپنے آپ کو یورپ کی دفاعی لائن قرار دے رہا ہے اور بہت حد تک ایسا ہے بھی۔ دوسری طرف امریکا ہے کہ یوکرین کے معاملے میں اب تک ذہن واضح نہیں کر پا رہا۔ یورپ کے بیشتر قائدین کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ اگر انہوں نے یوکرین کی امداد روک دی یا بہت زیادہ کم کر دی تو معاملات تیزی سے خرابی کی طرف جائیں گے کیونکہ ایسا کرنے سے روس کی حوصلہ افزائی ہوگی، اُس کی افواج غیر معمولی مورال کے ساتھ آگے بڑھیں گی اور یوکرین کو روندتی ہوئی مین لینڈ یورپ کی طرف بڑھنے اور اُسے ہڑپ کرنے کا سوچیں گی۔ اگر ایسا ہوا تو تیسری عالمی جنگ کے چھڑنے کا امکان بڑھ جائے گا۔ جرمن حکومت نے ۲۰۲۵ء میں یوکرین کے لیے فوجی امداد میں ۵۰ فیصد کٹوتی کر دی ہے۔ اب جرمنی کی طرف سے یوکرین کو ۸ کے بجائے ۴ ارب یورو کی فوجی امداد ملے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا یوکرین کے فوجیوں کا مورال مزید گرے گا۔

امریکا اِس وقت بہت نازک موڑ پر کھڑا ہے۔ یورپ بہت حد تک اپنی راہیں الگ کر چکا ہے۔ امریکا اور یورپ نے مل کر دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک عالمی سیاسی و معاشی نظام چلایا ہے۔ اس وقت دنیا میں جو مالیاتی نظام رُوبہ عمل ہے وہ بھی امریکا اور یورپ ہی کا وضع کردہ ہے اور دونوں اِس پر متصرف بھی ہیں۔

امریکا اور یورپ کی مشترکہ مشکل یہ ہے کہ چین، روس اور بھارت غیر معمولی حد تک مستحکم ہو چکے ہیں۔ روس اگر مستحکم نہ ہوتا تو یوکرین پر جنگ مسلط کرنے کی حماقت ہرگز نہ کرتا۔ نیٹو کا پھیلاؤ روکنے کے نام پر اُس نے یوکرین کو سبق سکھانے کی ٹھانی تو اُس کے حمایتی ایک طرف ہو گئے۔ امریکا نے سوا دو سال کے دوران روس کو کئی بار انتہائی نوعیت کی دھمکیاں دی ہیں اور یورپ بھی دھمکانے کے معاملے میں پیچھے نہیں رہا مگر ہوا کیا؟ ٹائیں ٹائیں فِش! اگر امریکا اور یورپ نے یوکرین کے معاملے کو واقعی اپنی ذمہ داری گردانا ہوتا تو روس کی مجال نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر یوکرین کو ہڑپنے کی کوشش کرتا۔

یورپ پَر سمیٹ کر اپنے آشیانے میں سمٹا ہوا ہے۔ وہ سہما ہوا بھی ہے۔ سیدھی سی بات ہے، یورپ کی حیثیت شیشے کے گھر کی ہے۔ وہ بھلا کیوں چاہے گا اُس کا شیشے کا گھر جنگ کے پتھروں سے کرچی کرچی ہو جائے۔ رُوس اور چین دونوں ہی دنیا کو مسخر کرنے نکلے ہیں۔ طریقے البتہ مختلف ہیں۔ چینی معاشی اور مالیاتی قوت کے بل پر آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس نے ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی قدم جما لیے ہیں۔ روس معاشی استحکام اور ٹیکنالوجی یعنی نرم قوت سے کہیں بڑھ کر سخت قوت یعنی فوجی طاقت کے ذریعے اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہے۔ روس اور چین کے طریقِ کار میں فرق ہے مگر مقاصد دونوں کے ایک ہیں اور اسی لیے وہ ایک پلیٹ فارم پر رہتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اُن کے درمیان اشتراکِ عمل تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ بات امریکا اور یورپ کے ساتھ ساتھ بھارت کے لیے بھی بہت پریشان کن اور تشویش ناک ہے کیونکہ بھارت اِن میں سے کسی کا بھی نہیں اور ہونا چاہتا بھی نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ امریکا اور یورپ کو بھی آنکھیں دکھانے پر تُلا ہوا ہے۔ بھارتی قیادت کے ذہن میں بیرونِ ملک کام کرنے والے بھارتی باشندوں کے ذریعے بہت کچھ حاصل کرنے اور دُنیا کو لُوٹنے، پلٹنے کا خنّاس سمایا ہوا ہے۔ وہ علاقائی اور عالمی سیاست و معیشت میں اپنے لیے بڑا کردار چاہتا ہے، اِس کا خواہش مند ہے کہ اُس کی برتر حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ بھارتی قیادت صرف لینا چاہتی اور جانتی ہے، کچھ دینے کی روادار نہیں۔

امریکا کی مشکل یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اُس نے یورپ سے مل کر جو سیاسی، معاشی، مالیاتی اور تزویراتی نظام تیار کیا وہ اب کمزور پڑ چکا ہے۔ سیاسی اور تزویراتی امور کے دنیا بھر کے ماہرین اس بات کو سمجھتے ہیں کہ امریکا تنِ تنہا تو کیا، یورپ کے ساتھ مل کر بھی موجودہ عالمی نظام نہیں چلا سکتا۔ لازم ہے کہ نیا عالمی نظام لایا جائے جس میں یورپ اور امریکا کے ساتھ ساتھ چین، روس، بھارت، برازیل، جنوبی افریقا، ترکی اور چند دیگر مسلم ممالک کے لیے بھی کچھ ہو تاکہ توازن برقرار رہے۔ سرد جنگ کے خاتمے پر دنیا یک قطبی رہ گئی تھی یعنی امریکا واحد سپر پاور تھا اور ہے مگر یہ بات اب سبھی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ واحد سپر پاور کی اصل طاقت کتنی رہ گئی ہے۔ امریکا نے چونکہ موجودہ تھکے ہارے اور فرسودہ عالمی نظام میں بہت زیادہ پنجے گاڑے ہوئے ہیں اِس لیے وہ معاملات کا فائدہ اٹھا رہا ہے تاہم درحقیقت اُس کی حیثیت اُس بدمعاش کی سی رہ گئی ہے جس کی طاقت تو بہت گھٹ چکی ہو مگر نام چل رہا ہو، بھرم

باقی ہو۔ امریکی قیادت بھی اچھی طرح جانتی اور سمجھتی ہے کہ اس وقت جو کچھ بھی ہاتھ لگ رہا ہے وہ صرف بھرم کی مہربانی سے ہے۔ طاقت نہیں رہی مگر ٹھسکا باقی ہے اِس لیے ٹھیکے کی مشین میں معاملات کو ڈال کر گنّے کی طرح نچوڑا جا رہا ہے۔ امریکا اور یورپ دونوں ہی خطوں کے قائدین جانتے ہیں کہ اُن کی برتری کے دن تھوڑے ہیں اِس لیے جتنا کچھ بھی سمیٹا جاسکتا ہو سمیٹ لیا جائے۔

امریکا کے لیے یہ بہت نازک وقت ہے۔ برطانیہ اس وقت یورپی یونین سے الگ کھڑا ہے۔ ادھر امریکا بھی الگ تھلگ سا ہے کیونکہ برطانیہ اور یورپی یونین کے ارکان دونوں ہی اُس پر مکمل بھروسا کرنے کو تیار نہیں۔ برطانیہ اور یورپی یونین کی کسی بھی خطے میں کوئی نئی عسکری مُہم جوئی شروع کرنے کی نیت ہے نہ طاقت۔ یوکرین کے ذریعے روس نے ویسی ہی ٹانگ اڑائی ہوئی ہے۔ ایسے میں مزید کون سی عسکری مُہم جوئی کا سوچا جائے؟

امریکی قیادت پر غیر معمولی دباؤ ہے۔ یوکرین پر روس کی مسلط کردہ جنگ نے یورپ کے لیے خطرات بڑھا دیے ہیں۔ روس نے اگر یوکرین کو واضح شکست دے دی تو مین لینڈ یورپ اور برطانیہ کا دباؤ میں آنا فطری امر ہوگا۔ روس کی فتح امریکا کے لیے بھی خاصی حوصلہ شکن ہوگی۔ امریکی قانون سازوں اور پالیسی سازوں کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ امریکا ایک ٹیلی فون کال پر کسی بھی خطے میں اپنی مرضی کے فیصلے منوائے اور اپنی مرضی سے کچھ بھی کرتا پھرے۔

دنیا بہت بدل چکی ہے۔ جنوبی ایشیا کے سیاسی و معاشی اور تزویراتی محرکات بہت بدل گئے ہیں۔ چین اور روس کی شکل میں ایشیائی ممالک کے لیے وہ بڑے سُتون موجود ہیں جن پر اپنی مرضی کی چھت ڈالی جاسکتی ہے۔ پاکستان جیسے ممالک اگرچہ اپنی مرضی سے فیصلے نہیں کر پاتے مگر پھر بھی اُنہیں اب بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنا امریکا کے لیے ممکن رہا ہے نہ یورپی طاقتوں کے لیے۔ مارکیٹ میں مسابقت بڑھ گئی ہے۔ امریکا اور یورپ زیادہ دباؤ ڈالیں گے تو بازار میں چین اور روس کی شکل میں دو بڑے سُپر اسٹور موجود ہیں، پس ماندہ ممالک اُن سے خریداری شروع کر دیں گے!

امریکا کی سیاست کا الجھ جانا انتہائی پریشان کن، بلکہ خطرناک ہے۔ دنیا کو نئے سیاسی و معاشی نظام کی ضرورت ہے۔ تزویراتی حرکیات میں توازن اور نظم و ضبط پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ امریکا میں سیاسی قیادت مضبوط اور بالغ نظر ہو۔ کیا ایسا ہے؟ لگتا تو نہیں۔ امریکی پالیسی ساز اور حقیقی فیصلہ ساز چاہے جیسے بھی ہوں، جو چہرہ سامنے ہے وہ تو انتہائی مایوس کن ہے۔

امریکی صدر جو بائیڈن نے چند ماہ کے دوران ایسا بہت کچھ کیا ہے جو معاملات کو الجھانے کا باعث بنا ہے۔ وہ ۸۱ سال کے ہیں۔ کم و بیش تین ماہ تک معاملہ یہ رہا کہ امریکا میں دونوں صدارتی امیدواروں نے ووٹرز پر دباؤ ڈالا ہوا تھا۔ صدر جو بائیڈن بضد تھے کہ ہر حال میں الیکشن لڑیں گے اور دوبارہ صدر بنیں گے۔ دوسری طرف ری پبلکن صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ بھی ڈٹے ہوئے ہیں۔ امریکی ووٹر خود کو بہت ہی نازک مقام پر محسوس کر رہے تھے۔ اُن کے لیے ایک طرف پہاڑ تھا اور دوسری طرف کھائی۔ لوگ سوچ سوچ کر پریشان تھے کہ کریں تو کیا کریں، ووٹ دیں تو کسے دیں۔ اگر چھوٹی اور بڑی بُرائی کا معاملہ بھی ہو تو دِل کو یہ سوچ کر سکون مل جاتا ہے کہ چلو، چھوٹی بُرائی کو گلے لگالو۔ امریکا میں تو معاملہ دونوں طرف بُرائی ہی بُرائی کا تھا۔

صدر بائیڈن کی جسمانی و ذہنی صحت جواب دے چکی ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے سو جاتے ہیں۔ خطاب کے دوران بنیادی حقائق بھول جاتے ہیں۔ کسی کو متعارف کراتے وقت کچھ کا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ اُن کی زبان کے پھسلنے کے اِتنے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ ہالی وُڈ والے چاہیں تو فلم نہیں بلکہ سیکوئلز بنا سکتے ہیں۔

صدر بائیڈن کی صحت کے حوالے سے اب اِتنا کچھ سامنے آچکا ہے کہ کسی کے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ کچھ دن پہلے یہ خبر آئی کہ صدر بائیڈن کی رعشہ یعنی کانپنے، لرزنے کی بیماری کے علاج کے لیے ایک معروف نیورو سرجن آٹھ ماہ کے دوران باقاعدگی سے امریکی ایوانِ صدر آتا رہا ہے۔

پہلے صدارتی مباحثے کے دوران صدر بائیڈن کی کارکردگی اس قدر ناقص رہی کہ ڈیموکریٹس کئی دن تک منہ چُھپاتے پھرے۔ اس مباحثے میں صدر بائیڈن نے بہت سے بنیادی حقائق غلط بیان کیے۔ اُنہوں نے بعض دعوے بھی غلط کیے۔ غلط بیانی تو خیر ڈونلڈ ٹرمپ نے بھی کی تاہم سب جانتے ہیں کہ وہ بدنیتی کا معاملہ تھا۔ صدر بائیڈن تو ذہنی کمزوری کے باعث مباحثے میں عمدگی کا مظاہرہ نہ کر پائے۔

صدر بائیڈن پر ڈیڑھ دو ماہ سے شدید نکتہ چینی کی جارہی تھی۔ ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر بھی اُن کی صحت کے حوالے سے بہت کچھ آرہا تھا۔ حد یہ ہے کہ ڈیموکریٹس نے بھی اُن پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ انتخابی دوڑ سے الگ ہو جائیں۔ صدر بائیڈن نے کئی مواقع پر خاصے جارحانہ انداز سے، بلکہ مشتعل ہو کر اپنے مخالفین اور ناقدین سے کہا کہ وہ انتخابی دوڑ سے الگ نہیں ہوں گے۔

یہ سب کچھ اُس وقت بدلا جب پنسلوانیا کے شہر بٹلر میں سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ پر نام نہاد قاتلانہ حملہ ہوا۔ ایک گولی اُن کے دائیں کان کے اوپری حصے کو چُھو کر گزری تو سب کچھ اُن کے حق میں پلٹ گیا۔ اُنہوں نے زخمی ہو کر گرتے گرتے مُکا فضا میں لہرایا اور خود کو ''فائٹر'' ثابت کر کے قوم کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔

یہ سب کچھ صدر بائیڈن کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اُنہوں نے تو سوچا ہی نہ ہوگا کہ سب کچھ یوں پلٹ جائے گا۔ وہ بڑھک مارتے آرہے تھے کہ وہ کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کر سکتے ہیں، مذاکرات کی میز پر دنیا کے کسی بھی لیڈر سے ڈٹ کر بات کر سکتے ہیں۔ کئی انٹرویوز میں اُن سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اپنی کمزور جسمانی و ذہنی کیفیت کے باوجود عالمی سیاست و معیشت کا دباؤ جھیل پائیں گے تو اُن کا کہنا تھا کہ میں اب بھی پوری طرح فِٹ ہوں اور کسی بھی صورتِ حال سے اچھی طرح نپٹ سکتا ہوں۔

جب ٹرمپ ہمدردی کی ملک گیر لہر پر سوار ہو کر آگے نکل گئے تو صدر بائیڈن کے پاس پسپا ہونے کے سوا چارہ نہ رہا اور اُنہوں نے کہنا شروع کیا کہ نائب صدر کملا ہیرس ملک کے صدر کے منصب پر بیٹھنے کی پوری اہل ہیں۔ اُن کے اس بیان کو امریکی اور یورپی میڈیا نے بہت اہم قرار دیا۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ صدر بائیڈن کورونا وائرس کی زد میں آگئے ہیں۔ معاملہ اگرچہ بہت پریشان کن نہ تھا یعنی اُن کی حالت زیادہ خراب نہ تھی مگر اِتنا تو طے تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے غیر متحرک ہو جائیں گے، اُنہیں آرام کرنا ہی پڑے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اُن کے غیر متحرک ہو جانے سے ڈیموکریٹس کی پوزیشن انتخابی دوڑ میں مزید کمزور پڑ گئی۔ صدر بائیڈن نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر طبّی پیچیدگیاں بڑھ گئیں تو وہ انتخابی دوڑ سے الگ بھی ہو سکتے ہیں۔ یوں بھی امریکا بھر میں 32 فیصد سے زیادہ ڈیموکریٹس چاہتے تھے کہ صدر بائیڈن کو اب انتخابی دوڑ سے الگ ہو جانا چاہیے۔

امریکی میں انتخابی دوڑ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ صدر بائیڈن انتخابی دوڑ سے الگ ہو چکے ہیں۔ اب

سارا بوجھ کملا ہیرس کے کاندھوں پر ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا کملا ہیرس ساڑھے تین ماہ میں اپنے آپ کو منوانے اور امریکی ووٹرز کی اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو پائیں گی۔ وہ بائیڈن کے مقابلے میں خاصی کم عمر ہیں اور ذہنی طور پر خاصی توانا بھی مگر اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ وہ خاتون ہیں اور ووٹرز کے لیے فیصلہ بہت مشکل ہوگا۔

نیو یارک ٹائمز نے ٹرمپ پر حملے سے قبل لکھا تھا کہ امریکی ووٹر انتہائی نوعیت کے مخمصے کا شکار ہیں کیونکہ ایک صدارتی امیدوار جسمانی و ذہنی طور پر بہت کمزور ہے اور دوسرا انتہائی خطرناک۔ نیویارک ٹائمز نے ڈونلڈ ٹرمپ کی ذہنیت اور پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اپنے پہلے دورِ حکومت میں بھی انہوں نے بعض انتہائی پریشان کن اقدامات کیے تھے، چین سے تجارتی جنگ کی داغ بیل ڈالی تھی اور امریکی معیشت کے لیے انتہائی نوعیت کی مشکلات پیدا کی تھیں۔ اب بھی وہ تارکینِ وطن کے خلاف جانے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ صاف کہہ چکے ہیں کہ اگر وہ دوبارہ صدر منتخب ہوئے تو تمام غیر قانونی تارکینِ وطن کو نکال باہر کریں گے اور اس کام میں اُنہیں فوج سے بھی مدد لینا پڑی تو ایسا کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

ایک اور پریشان کن بات یہ ہے کہ ٹرمپ چونکہ خود انتہائی مالدار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے اُس طبقے کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے حوالے سے اپنی سوچ بھی ظاہر کردی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دوبارہ صدر منتخب ہونے کی صورت میں وہ انتہائی مالدار طبقے پر ٹیکس کا بوجھ کم کردیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکا کو چلتا رکھنے کا سارا بوجھ غریب اور متوسط طبقے کے امریکی برداشت کریں گے اور بالخصوص تنخواہ دار طبقے کو سب سے زیادہ بوجھ برداشت کرنا پڑے گا۔

تارکینِ وطن کے خلاف کارروائیوں اور غریب و متوسط طبقے پر ٹیکسوں کا بوجھ لادنے کی ذہنیت ہی کے حوالے سے نیویارک ٹائمز نے ٹرمپ کو خطرناک قرار دیا ہے۔ امریکی ووٹر پریشان تھے کہ کسے ایوانِ صدر پہنچائیں:

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

امریکی صدارتی انتخاب کے ماحول کو دیکھ کر بہت عجیب سے محسوسات ابھر رہے ہیں۔ کیا امریکی سیاست کے پاس قیادت کے لیے ایسے ہی آپشن رہ گئے ہیں؟ کیا ٹرمپ کو مزید چار سال کے لیے امریکا کی کمان سونپی جاسکتی ہے؟ اپنے پہلے عہدِ صدارت میں اُنھوں نے امریکی صدر کے منصبِ جلیلہ پر مسخرے پن کی انتہا کردی تھی۔ قاتلانہ حملے کے بعد ٹرمپ سے ہمدردی کی ایک لہر اٹھی ہے جس پر سوار ہو کر وہ بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ٹرمپ کے لیے امکانات روشن ہیں مگر کیا امریکا کے لیے بھی امکانات روشن ہیں؟ اگر ڈونلڈ ٹرمپ دوبارہ صدر منتخب ہوئے تو امریکی پالیسیوں اور فیصلوں کا کیا ہوگا؟ کیا وہ اِس نازک مرحلے پر عالمی امور میں امریکا کی پوزیشن کا معقول طریقے سے دفاع کر سکیں گے؟ امریکا اور یورپ کو مل کر چار پانچ سال کے اندر کسی نئے عالمی نظام کی راہ ہموار کرنی ہے۔ وہ چین، روس اور بھارت کو نظر انداز کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ مسلم دنیا کو بھی اب سرد خانے میں رکھنا ممکن نہیں۔ اگر مسلم ممالک نے امریکا اور یورپ سے بیزار ہو کر تھوڑی سی ہمت دکھاتے ہوئے اپنے آپ کو چین اور روس کی طرف جھکا دیا تو کیا ہوگا؟ بہت کچھ بدل اور پلٹ جائے گا۔ ایسے میں امریکی قیادت کسی ایسی شخصیت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جو معقول انداز سے سوچ سکے اور ڈھنگ کے فیصلے کر سکے، اپنی بات کُھل کر بیان کر سکے، اپنا موقف ڈھنگ سے منوا سکے۔ ٹرمپ کے مزاج کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہے کہ وہ عالمی امور میں امریکا کی برتری برقرار رکھنے کے چکر میں بہت کچھ داؤ پر لگا سکتے ہیں۔

صدر بائیڈن انتخابی دوڑ سے الگ تو ہو چکے ہیں تاہم اُن پر شدید تنقید کی جارہی ہے کہ اُنھوں نے یہ فیصلہ خاصی تاخیر سے کیا ہے۔ انہیں جنوری یا فروری میں طے کرلینا چاہیے تھا کہ اب اُن سے یہ گاڑی آگے نہ چلائی جاسکے گی۔ صدر بائیڈن کی ہٹ دھرمی اور انتخابی دوڑ سے الگ ہونے میں تاخیر نے ڈیموکریٹس کو دیوار سے لگادیا ہے۔ کملا ہیرس کے لیے اپنے آپ کو منوانا آسان نہ ہوگا۔ ٹرمپ نے اپنے کارڈ اچھی طرح کھیلے ہیں۔ بہت سوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ پنسلوانیا کے شہر بٹلر میں قاتلانہ حملہ بھی کہیں ٹرمپ کی طرف سے کھیلا جانے والا ایک اچھا کارڈ تو نہیں تھا! اُنہیں عوام کی ہمدردیاں درکار تھیں جو مل گئیں۔ اور اس سے بڑی بات یہ ہوئی ہے کہ اُن پر تنقید کرنے والوں کے منہ بند ہوگئے ہیں۔ میڈیا بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ فی الحال اُن پر زیادہ نکتہ چینی کر سکے۔

امریکی صدارتی انتخاب میں ڈیموکریٹ امیدوار کا بدل جانا معمولی بات نہیں۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ جب براک اوباما کو صدارتی امیدوار نامزد کیا گیا تھا تب یہ سوال اٹھا تھا کہ وہ خود تو مسیحی ہیں مگر اُن کا پس منظر مسلم ہے یعنی اُن کا ددھیال مسلم ہے۔ اب کیا کملا ہیرس کی نامزدگی پر ایسا کوئی سوال نہیں اٹھے گا جبکہ اُن کی ماں شیاملا گوپالن ہندو تھیں اور اُن کا تعلق بھارت کے شہر چنئی (مدراس) سے تھا اور والد ڈونلڈ ہیرس جزائر غرب الہند کے علاقے جمیکا کے تھے۔ ڈونلڈ ہیرس اور شیاملا گوپالن نے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ایک دوسرے کو پسند کیا اور شادی کی۔

کملا کے نام کا مطلب ہے کنول کا پھول۔ اور یہی ہندوؤں کی دیوی لکشمی کا متبادل نام بھی ہے۔ ایسے میں یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ اگر وہ صدر منتخب ہوئیں تو امریکا میں آباد ہندوؤں کے علاوہ خود بھارت بھی قدرے موافق پوزیشن میں ہوگا۔

امریکا کو اگلے چار سال کے لیے موزوں ترین امیدوار درکار رہے۔ اگر ٹرمپ کامیاب ہوتے ہیں تو دنیا کو اگلے چار برس کے دوران امریکا کی طرف سے انتہائی نوعیت کی سوچ اور قدرے غیر عاقلانہ فیصلوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کملا ہیرس کو ہم چھوٹی بُرائی قرار دے کر مطمئن ہوسکتے ہیں۔ اُن کی کامیابی کی صورت میں معاملات بہرحال زیادہ بُرے نہیں رہیں گے۔


اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک-5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

# غزہ کی قیمت ہماری جیب بھی دے رہی ہے!

**وسعت اللہ خان**

گلوبل ویلج ہونے کے جہاں بے شمار فائدے ہیں وہیں نقصانات بھی ہیں۔ مثلاً تین برس پہلے تک روس اور یوکرین کی گندم پر چالیس سے زائد ممالک (بیشتر افریقی ممالک) کا دار و مدار تھا۔ گندم کی کُل عالمی پیداوار کا پچیس فیصد انہی دو ممالک پر منحصر تھا۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ دونوں میں ایک طویل جنگ چھڑ جائے گی اور اس کے سبب گندم مہنگی ہو جائے گی۔ یعنی ہزاروں کلومیٹر پرے ہونے والی جنگ کے اثر سے ایتھوپیا کے پہاڑوں میں رہنے والا کسان اور بنگلادیش کے سندربن میں بسنے والا مچھیرا یکساں متاثر ہو رہا ہے۔

اسی طرح پچھلے دس ماہ سے غزہ میں جاری اسرائیلی نسل کشی محض دو قوموں کی بقا کا معاملہ نہیں رہا بلکہ اس بحران سے کم از کم ۶۵ ممالک براہ راست اور باقی بلاواسطہ متاثر ہو رہے ہیں۔ مگر کیسے؟ یہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۷/اکتوبر کو حماس نے جنوبی اسرائیل پر حملہ کیا۔ تین روز بعد غزہ پر انتقامی اسرائیلی یلغار شروع ہوئی۔ اس کے ایک ہفتے بعد اسرائیل کی شمالی سرحد پر لبنانی حزب اللہ نے فلسطینیوں سے یکجہتی میں اسرائیل پر حملے شروع کر دیے۔ اسرائیل نے جنوبی لبنان میں حزب اللہ کے خلاف جوابی کارروائیاں شروع کر دیں۔ جبکہ اسرائیل سے اٹھارہ سو کلومیٹر جنوب میں واقع ملک یمن کی حوثی انتظامیہ بحیرۂ قلزم میں ایسے بحری جہازوں کو نشانہ بنا رہی ہے جو اسرائیلی تجارت سے منسلک ہیں۔

اسرائیل کی نوے فیصد درآمد و برآمد سمندری راستے سے ہوتی ہے۔ اس وقت بحیرۂ روم کے کنارے واقع مرکزی اسرائیلی بندرگاہ حیفہ حزب اللہ کے میزائیلوں کی زد میں ہے۔ چنانچہ درآمد و برآمد کا بیشتر دباؤ غزہ سے متصل بندرگاہ اشدود پر ہے۔ جبکہ انتہائی جنوب میں بحیرۂ قلزم کی جانب خلیجِ عقبہ میں کھلنے والی تیسری بڑی بندرگاہ ایلات یمنی حوثیوں کی ناکہ بندی کے سبب دیوالیہ ہو چکی ہے۔ ایلات کی بندرگاہ پر ایشیا سے درآمد و برآمد ہوتی ہے۔ ان میں سالانہ ڈیڑھ لاکھ گاڑیاں بھی شامل ہیں۔ مگر اس سال صرف ایک مال بردار جہاز ہی ایلات پہنچ پایا۔ چنانچہ بندرگاہ کے آدھے عملے کی چھانٹی ہو گئی اور بقول شخصے تالا لگ گیا۔

بحیرۂ قلزم عالمی معیشت کے لیے سب سے اہم گزرگاہ ہے۔ کیونکہ اس کے شمالی سرے پر نہر سویز ہے جو یورپ اور ایشیا کی اقتصادی شہ رگ ہے۔ جبکہ بحیرۂ قلزم کے جنوبی سرے پر افریقا اور یمن کے درمیان واقع بیس میل چوڑی آبنائے باب المندب ہے جو بحیرۂ ہند میں کھلتی ہے۔ برطانیہ اور امریکا پچھلے آٹھ ماہ سے پوری بحری طاقت لگانے کے باوجود باب المندب کی ناکہ بندی ختم نہیں کروا سکے۔ اور اب اسرائیلی فضائیہ بھی ان حملوں میں شامل ہو گئی ہے۔

حوثیوں نے ناکہ بندی کے خاتمے کو غزہ میں جنگ بندی سے مشروط کر رکھا ہے۔ انہوں نے اب تک دو تجارتی جہاز ڈبوئے ہیں۔ امریکا کے ایک جنگی جہاز کو نقصان پہنچایا ہے۔ متعدد جہازوں اور عملے کو پکڑ رکھا ہے۔ اسرائیلی بندرگاہ ایلات پر ڈرون اور میزائیل حملے کر کے اس بندرگاہ کو ناکارہ کر دیا ہے۔ جبکہ ان کے ڈرونز کی مار تل ابیب تک ہے۔

اس پورے کھیل میں بحیرۂ قلزم کے شمالی سرے پر بیٹھے مصر کو بھی ٹھیک ٹھاک معاشی جھٹکا لگا ہے۔ نہر سویز سے مصر کی آمدنی دس ارب ڈالر سالانہ سے زائد ہے۔ انیس ہزار مال بردار جہاز ایک ٹریلین ڈالر کا مال لے کر ہر سال اس نہر سے گزرتے ہیں۔ دس سے پندرہ فیصد عالمی تجارت اور تیس فیصد کنٹینرز نہر سویز اور باب المندب سے آتے جاتے ہیں۔

جب سے حوثیوں نے ناکہ بندی کی ہے، مصر کی نہری آمدنی ۸۰ فیصد گھٹ گئی ہے۔ وہ نہر جس سے گزشتہ برس ماہانہ اوسطاً ۱۲۰/جہاز گزرتے تھے، اِس برس ماہانہ اوسطاً ۲۴ جہاز گزر رہے ہیں۔ مصر نے جہازی کمپنیوں کو راغب کرنے کے لیے رعایتی پیکیج کا بھی اعلان کیا ہے۔ مگر دنیا کی ۲۶ بڑی جہاز راں کمپنیوں میں سے کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔

ان کمپنیوں نے باب المندب کی ناکہ بندی سے بچنے کے لیے یورپ اور ایشیا کو تجارتی طور پر جوڑنے والا قدیم بحری راستہ بطور متبادل اختیار کیا ہے۔ یعنی واسکوڈی گاما کی طرح پورا براعظم افریقا گھوما جائے۔ چنانچہ ایشیا اور یورپ کے درمیان سفر میں ساڑھے چھ ہزار کلومیٹر (ساڑھے تین ہزار ناٹیکل میل) کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان جہازوں کو نہر سویز کے سفر کی نسبت چودہ دن اضافی سفر کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ ان جہازوں کے ایندھن کا خرچہ فی چکر ایک ملین ڈالر تک بڑھ گیا ہے۔ انشورنس پریمیم بھی آسمان کو چھو رہا ہے۔ جہاز رانوں کو زیادہ تنخواہیں دینا پڑ رہی ہیں اور راستے میں کسی بندرگاہ پر اضافی قیام کا خرچہ بھی الگ سے پڑ گیا ہے۔

یہ سب لاگت جوڑ لی جائے تو اس بحران کے نتیجے میں عام آدمی تک پہلے جو شے سو روپے میں پہنچ رہی تھی، اب وہی شے دو سو سے ڈھائی سو روپے میں پڑ رہی ہے۔ یعنی ہم اور آپ بھی اسرائیل کی غزہ پر چڑھائی کی قیمت نہ چاہتے ہوئے ادا کر رہے ہیں۔

انٹرنیشنل میری ٹائم آرگنائزیشن کا ہدف ہے کہ ۲۰۳۰ء تک جہاز رانی کے شعبے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں ۴۰ فیصد کمی ہو جائے۔ اگر جنگوں کے نتیجے میں عالمی تجارت ایسے ہی تلپٹ ہوتی رہی اور جہاز رانی یوں ہی متاثر ہوتی رہی تو تمام مقررہ ماحولیاتی ہدف حتمی تاریخ گزرنے کے بعد بھی ہم سب کا منہ تکتے رہیں گے۔

ایشیا اور یورپ کے مابین تجارت کے لیے کرۂ ارض کے انتہائی شمال میں آرکٹک سرکل کی برف پگھلنے کے نتیجے میں ممکنہ بحری راستے کے استعمال پر کئی برس سے غور ہو رہا ہے تاکہ نہر سویز کی محتاجی ختم ہو جائے۔ مگر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں ابھی خاصا وقت اور سرمایہ درکار ہے۔

اسرائیل غزہ پر کنٹرول اس لیے بھی چاہتا ہے کہ بحیرۂ روم کو بحیرۂ قلزم سے ملانے والی ایک سو بیس کلومیٹر طویل (بن گوریان کینال) تعمیر کر سکے۔ اس نہر سے نہ صرف سپر ٹینکرز گزر سکیں گے بلکہ نہر سویز کی بندش کے سبب پیدا ہونے والے معاشی بحران سے بھی نمٹا جا سکے۔ اس منصوبے سے اسرائیل کو ٹرانزٹ فیس کے طور پر بیس ارب ڈالر سالانہ ملنے کی توقع ہے۔ اسرائیل اسے قابلِ عمل منصوبہ سمجھتا ہے جو صرف بارہ برس میں اپنی لاگت پوری کر سکتا ہے۔

حالانکہ اسرائیل کی نسل کش پالیسیوں کو روکنے سے مشرقِ وسطیٰ کا بحران ایک دن میں حل ہو سکتا ہے۔ تاہم ریاستیں اندھی طاقت کے بجائے عقل کو بحران کے حل کا چانس آسانی سے دیں تو پھر بات ہی کیا ہے۔

مسئلہ تو کوئی بھی چٹکی بجاتے حل ہو سکتا ہے۔ اصل فن تو رتی برابر معاملے کو طول دے کر اسے دودھ دینے والی گائے بنانا ہے۔ اسی کو انگریزی میں ڈپلومیسی کہتے ہیں۔

(بحوالہ: روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی۔ ۲۷ جولائی ۲۰۲۴ء)

# افغانستان میں غیر ملکی سیاحوں کی دلچسپی کیوں؟

**فلورا دروری**

دنیا بھر میں جب کوئی بیرونِ ملک چھٹیاں گزارنے کے لیے بہترین ممالک کی فہرست بناتا ہے تو اس میں بیشتر لوگوں کی فہرست سے افغانستان غائب ہوتا ہے۔

اس کے پس پشت دہائیوں سے جاری تنازعات ہیں کیونکہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ’ہپی ٹریلز‘ کے ایک حصے کے طور پر اس کے عروج کے زمانے کے بعد سے بہت کم سیاحوں کی وسطی ایشیا کے اس ملک میں قدم رکھنے کی ہمت ہوئی ہے۔

افغانستان میں سیاحت کی جو چھوٹی سی صنعت موجود تھی اس کا مستقبل بھی ۲۰۲۱ میں طالبان کی اقتدار میں واپسی کے باعث غیر یقینی کا شکار ہو گیا تھا۔

لیکن اگر آپ سوشل میڈیا پر نظر دوڑائیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ افغانستان میں نا صرف سیاحت موجود ہے بلکہ وہ غیر معمولی طریقے سے عروج پر بھی ہے۔

’آپ کا اگلا سفر افغانستان ہونا چاہیے: پانچ وجوہات‘ کے عنوان سے پرجوش سیاحوں کو وہاں کی چمکتی جھیلوں، پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے، پُررونق اور مصروف بازاروں میں لطف اندوز ہوتے دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض نے ۲۰ سال قبل بامیان میں بدھا کے مجسموں کے ساتھ تصاویر شیئر کرتے ہوئے لکھا کہ ’افغانستان ۲۰ سال میں اتنا محفوظ کبھی نہیں رہا‘۔

ان سنہرے دعوؤں اور دلکش ویڈیوز کے باوجود مسافروں کو لاحق خطرات کے بارے میں سوالات بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ سوال بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ افغانستان کی سیاحت کی صنعت کس وجہ سے ترقی کر رہی ہے۔

یہ زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنے والی مقامی آبادی ہے یا طالبان کی حکومت ہے جو دنیا کے بیانیے کو اپنے حق میں بدلنا چاہتی ہے؟

ڈاکٹر فرخندہ اکبری کا خاندان ۱۹۹۰ء کی دہائی میں، جب طالبان پہلی بار افغانستان میں برسر اقتدار آئے تھے، اپنے ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ ٹک ٹاک پر ان ویڈیوز کو دیکھنا کسی ستم ظریفی سے کم نہیں ہے جہاں ایک طالبان گائیڈ اور طالبان اہلکار سیاحوں کو بدھ مت مذہب سے منسلک مجسموں کی تباہی کی جگہ کا دورہ کرنے کے لیے ٹکٹ دے رہے ہیں۔ ’یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان مجسموں کو تباہ کیا تھا‘۔

### ’ابھی تو یہ اچھوتی جگہ ہے‘

ساشا بینی نے جن ممالک کا دورہ کیا ہے ان کی فہرست پہلی نظر میں چھٹیاں گزارنے کے مثالی مقامات کی فہرست کی طرح نہیں لگتی کیونکہ ان کی فہرست میں شامل ممالک مختلف وجوہات کی بنا پر خبروں میں ہوتے ہیں۔

لیکن پھر یہ علم ہوتا ہے کہ بینی اور دنیا بھر میں ان جیسے ہزاروں لوگوں نے ان مقامات کو کیوں پسند کیا ہوگا۔ شاید وہ مشہور سیاحتی مقامات اور پانچ ستارہ ہوٹل کے عیش و آرام سے زیادہ سے زیادہ دور اور پوری طرح سے منفرد مقامات کے سبب ان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور شاید انھی وجوہات کی بنا پر افغانستان نے ان کا دل جیت لیا۔

برطانیہ میں برائٹن کی پارٹ ٹائم ٹریول گائیڈ نے کہا کہ ’یہ سب بالکل اچھوتا ہے۔ اگر آپ حقیقی زندگی دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کے لیے پرکشش ہو سکتا ہے‘۔

طالبان کو اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ حالانکہ ان کی وجہ شہرت ہی باہر کے لوگوں، خاص طور پر مغربی باشندوں کے متعلق مشکوک اور بعض اوقات مخالف ہونا ہے۔

اس کے باوجود وہ قدرے ہچکچاہٹ اور پُرتکلف انداز میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں اور ان کے ساتھ تصویریں کھنچوا رہے ہیں۔ ان کی بندوقوں اور لہراتی داڑھیوں کے ساتھ تصاویر خاص طور پر ٹک ٹاک پر وائرل ہو رہی ہیں۔ خیال رہے کہ ٹک ٹاک پر ۲۰۲۲ء سے افغانستان میں پابندی ہے۔

ایک سطح پر اس کا جواب آسان ہے۔ طالبان کو رقم کی ضرورت ہے کیونکہ وہ وسیع پیمانے پر پابندیوں کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر تنہائی کا شکار ہیں۔ انھیں افغانستان کی سابقہ حکومت کو دیے گئے فنڈز تک رسائی سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔

خبر رساں ادارے اے پی کے مطابق ۲۰۲۱ میں افغانستان جانے والے سیاحوں کی تعداد صرف ۶۹۱ تھی جو بڑھ کر پچھلے سال ۷۰۰۰ سے زیادہ ہو گئی ہے۔

بظاہر یہ ملک زیادہ تر بین الاقوامی کمپنیوں کی طرف سے پیش کردہ ہزار ہا مقامات میں سے ایک میں شامل ہوتا ہے لیکن ایک کشش یہ بھی ہے کہ آپ چند ہزار ڈالر میں ’حقیقی افغانستان‘ کا نظارہ کر سکتے ہیں۔

کابل میں طالبان حکومت کے ٹورزم ڈائریکٹوریٹ کے سربراہ محمد سعید نے رواں سال کے شروع میں کہا تھا کہ ان کا خواب ہے کہ ان کا ملک سیاحت کا مرکز بن جائے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی نظریں خاص طور پر چینی سیاحوں پر مرکوز ہیں۔

افغان ٹور گائیڈ روح اللہ نے تین سال قبل افغانستان میں ٹور گائیڈ کا کام شروع کیا اور ان سے مطمئن گاہکوں نے ان کے ساتھ مسکراتے ہوئے تصاویر لی ہیں جنھیں درجنوں بار شیئر کیا گیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ’سیاحت سے بہت ساری ملازمتیں اور مواقع پیدا ہوتے ہیں‘۔

### ’تبدیلی کے بعد‘

۲۰۲۱ء میں طالبان کے آنے کو وہ ’تبدیلی‘ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تبدیلی کے بعد ان کے ایک دوست نے ٹور گائیڈ کے طور پر نوکری کی پیشکش کی۔ اس سے پہلے وہ افغان وزارت خزانہ میں آٹھ سال کام کر چکے تھے۔ اور انھیں اپنے اس فیصلے پر افسوس نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بینی جیسے ٹور گروپس کو ڈرائیوروں اور مقامی گائیڈز کی ضرورت ہے اور وقت کے ساتھ سیاحوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اس لیے کام کی کوئی کمی نہیں ہے۔

بڑی تعداد میں مرد نوجوان کابل میں طالبان کی منظور شدہ مہمان نوازی کی کلاسوں میں شرکت کر رہے ہیں۔ وہ تیزی سے بڑھتی ہوئی صنعت سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ کلاسز لے رہے ہیں۔

روح اللہ کہتے ہیں: ’ہم اس سال بہت زیادہ سیاحوں کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ ایک پرامن وقت ہے۔ اس سے پہلے افغانستان کے تمام حصوں میں سفر کرنا ممکن نہیں تھا، لیکن اب یہ واقعی ممکن ہے‘۔

جنگجو گروپ دولت اسلامیہ سے وابستہ عسکریت پسند گروپ آئی ایس خراسان کی جانب سے مئی میں بامیان کے ایک بازار میں تین ہسپانوی سیاحوں اور ایک افغان کا قتل غیر معمولی واقعہ تھا کیونکہ اس میں غیر ملکیوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

برطانیہ کا دفتر خارجہ وہاں کسی بھی قسم کے سفر کے خلاف مشورہ دیتا ہے کیونکہ یہ ملک ان کے حملوں کا ہدف بنا ہوا ہے۔

ویسٹ پوائنٹ میں قائم کامبیٹنگ ٹیررزم سینٹر کے مطابق آئی ایس کے نے صرف ۲۰۲۳ء میں ملک میں ۴۵ حملے کیے ہیں۔

بلاشبہ اب افغانستان کی سیکورٹی میں اضافے کی ایک وجہ

یہ ہے کہ امریکی حملے کے بعد ۲۰ سالہ جنگ کے دوران، جس نے ملک کو لپیٹ میں لے رکھا تھا، طالبان خود زیادہ تر پرتشدد واقعات کے ذمہ دار تھے۔

مثال کے طور پر ۲۰۲۱ء کے پہلے تین مہینوں میں اقوام متحدہ کی ریکارڈ کی گئی ۱۷۸۳ عام شہریوں کی ہلاکتوں میں سے ۴۰ فیصد سے زیادہ کے لیے طالبان کو ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ صرف طالبان ہی نہیں تھے۔ اسی رپورٹ میں بتایا گیا کہ اسی عرصے میں ۲۵ فیصد ہلاکتوں کے لیے امریکی حمایت یافتہ افغان حکومتی فورسز ذمہ دار تھیں۔

## 'اصول جانیں اور کھیل سیکھیں'

سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ بینی کے ساتھ جو سیاح افغانستان کے دورے پر آئے وہ سب خواتین تھیں۔ اور وہاں صرف وہی تینوں خواتین نہیں تھیں۔ ینگ پاینیر ٹورز شمالی کوریا اور دیگر ایسے ہی مقامات پر چھٹیاں منانے کا طویل تجربہ رکھتا ہے اور وہ افغانستان کے لیے خصوصی طور پر خواتین کے دورے بھی منعقد کرواتا ہے۔ روح اللہ نے تنہا سفر کرنے والی خواتین کو 'بغیر کسی پریشانی کے' ملک کی سیر کرائی ہے۔

طالبان کی اپنی خواتین آبادی کے لیے سخت قوانین ہیں۔ ان کے دفاتر میں کام کرنے پر پابندیاں ہیں اور انہیں ثانوی تعلیم سے بھی باہر رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بند امیر نیشنل پارک میں بھی ان کا داخلہ ممنوع ہے لیکن باہر سے آنے والی خواتین کو داخل ہونے سے روکتے نہیں دیکھا گیا ہے۔

روون بیئرڈ ۲۰۱۶ء سے ملک میں سیاحتی گروہ لا رہے ہیں۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ افغانستان میں 'خواتین اور مردوں کا مختلف درجہ ہے' لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ کوئی بری چیز ہو۔

وہ بتاتے ہیں کہ 'مرد عورتوں سے بات نہیں کر سکتے لیکن خواتین کر سکتی ہیں۔ ہماری خواتین سیاحوں کو خواتین کے ایک گروپ کے ساتھ بیٹھنے اور ان سے اپنے تجربات اور ملک کے بارے میں مزید جاننے اور سننے کا موقع ملا'۔

لیکن ہر ایک کو چند قوانین پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ بینی اور ان کے گروپ کو پہلے سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ ان اصولوں کو پورا کرنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہوگی، بشمول یہ کہ وہ کس طرح کا لباس پہنیں، کیسے کام کریں اور وہ کس سے بات کر سکتی ہیں، اور کس سے نہیں کر سکتی ہیں۔

طالبان ہمیشہ موجود ہوتے ہیں اور اپنی بندوقوں کے ساتھ دور سے دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے بینی یا ان کے گروپ کی دیگر خواتین سے بات نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ 'آپ کو قوانین کو جاننا ہوگا اور کھیل کو سیکھنا ہوگا'۔

بینی کے لیے ان خواتین کے ساتھ بات کرنا جو 'ناقابل یقین حد تک خوش تھیں' ان کے دورے کی خاص بات تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں وہاں 'پیارے، سخی اور خوش آمدید کہنے والے لوگ نمایاں طور پر ملے۔

سوشل میڈیا پر پوسٹ کی جانے والی ویڈیوز میں خواتین گلیوں کے مناظر سے نمایاں طور پر غائب ہیں۔ اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ایک سیاح نے کہا کہ لوگوں کو فکر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ اندر ہیں اور وہ وہی کام کر رہی ہیں جو دنیا بھر کی خواتین کرنا پسند کرتی ہیں یعنی خریداری۔

## طالبان کے رویے پر 'اخلاقی جدوجہد'

ڈاکٹر اکبری کہتی ہیں کہ سیاحوں کا خیال ہے کہ 'یہ دنیا کا اتنا پسماندہ حصہ ہے کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں، ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے'۔ وہ اب آسٹریلیا کی موناش یونیورسٹی میں پوسٹ ڈاکٹریٹ محقق ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ سیاح سوچتے ہیں کہ 'ہم بس وہاں جاتے ہیں اور اس کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ویوز اور لائکس حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کی اس بات سے ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے'۔

وہ مزید کہتی ہیں: 'سیاسی اور سماجی بیداری کی کمی کے ساتھ سیاحت غیر اخلاقی ہے' جو طالبان کو زندگی کی حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی اجازت دیتی ہے۔

ڈاکٹر اکبری بتاتی ہیں: 'میرے خاندان میں کوئی مرد سرپرست نہیں ہے تو خواتین ایک ضلع سے دوسرے ضلع کا سفر نہیں کر سکتیں۔ ہم نصف آبادی کے بارے میں بات کر رہے ہیں جن کے پاس کوئی حقوق نہیں ہیں...... ہم ایک ایسی حکومت کے بارے میں بات کر رہے ہیں جس نے صنفی بنیاد پر نسل پرستی قائم کر رکھی ہے'۔ وہاں ایک انسانی بحران ہے: مجھے خوشی ہے کہ سیاح جا کر دکان سے کچھ خرید سکتے ہیں اور اس سے مقامی خاندان کی مدد ہو سکتی ہے، لیکن اس کی قیمت کیا ہے؟

بینی نے اعتراف کیا کہ دورہ کرنے سے پہلے انہیں خواتین کے بارے میں طالبان کے موقف پر 'اخلاقی جدوجہد' کرنی پڑی تھی۔ وہ کہتی ہیں: 'یقیناً، میں ان کے حقوق کے بارے میں بہت شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی لیکن پھر ایک مسافر کے طور پر میرے خیال میں یہ ممالک جانے کے لائق ہیں، اور ان کی بات سنی جانی چاہیے، ہمارے خیالات ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنا پسند ہے۔ میں اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہوں'۔

بیئرڈ کا استدلال ہے کہ لوگوں کو اپنے نتائج خود نکالنے دیں'۔

ناٹنگھم یونیورسٹی اسکول آف بزنس میں مارکیٹنگ اور سیاحت کی پروفیسر مارینا نویلی کہتی ہیں کہ سوشل میڈیا پر کچھ لوگوں کی طرف سے شیئر کیے گئے حد سے زیادہ مثبت نظریے کو یقینی طور پر پریشانی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

انہوں نے کہا: 'میں کسی منزل کی سنسنی خیزی کے بارے میں بہت محتاط رہتی ہوں' کیونکہ کچھ لوگ 'ایک ایسی تصویر پینٹ کر سکتے ہیں جو بچگانہ ہو'۔ بعض اوقات سیاح بھی ایک مثبت پیغام بھیجنا چاہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسائل (اب بھی موجود) نہیں ہیں'۔

بین الاقوامی سیاحت کے اخلاقی بورڈ پر بیٹھی پروفیسر نویلی کا کہنا ہے کہ بائیکاٹ کرنا بھی آگے نہیں لے جاتا ہے۔

'مجھے اس کے ساتھ مسئلہ ہے کیونکہ یہ ان ممالک کو اور بھی الگ تھلگ کر دیتا ہے'۔

اس سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ لکیر کہاں کھینچی جائے۔ وہ کہتی ہیں کہ شمالی کرۂ ارض میں سیاحتی مقامات کی بہتات ہے لیکن وہاں کی حکومتیں قابل اعتراض طرزِ عمل رکھتی ہیں۔ تاہم فائدے کے امکانات بھی قابل غور ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ سعودی عرب میں سیاحت کی بڑھتی ہوئی صنعت خواتین کے لیے معاشرے میں وسیع کردار کا باعث بنی ہے۔

پروفیسر نویلی کہتی ہیں: 'میرے خیال میں سیاحت امن کے لیے، ثقافتی تبادلے کے لیے ایک قوت ہو سکتی ہے'۔ اگرچہ سیاحت کی یہ صلاحیت ڈاکٹر اکبری جیسی خواتین اور افغانستان میں ان کے خاندان اور دوستوں کے لیے راہ آسان نہیں بناتی۔

(بحوالہ: 'بی بی سی اردو ڈاٹ کام'۔ ۲۲ جولائی ۲۰۲۴ء)


سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اوّل صدارتی ایوارڈ یافتہ

**سیرتِ سید الابرار ﷺ**

منیر احمد خلیلی

قیمت: ۱۲۰۰ روپے

**اکیڈمی بک سینٹر۔** فون: ۰۲۱-۳۶۳۶۸۰۲۰

# دنیا کو مفلوج کرنے والے سافٹ ویئر، چین کیسے محفوظ رہا

**نک مارش**

۱۹ جولائی کو جب دنیا بھر میں کاروبار اور سروسز آئی ٹی کی بندش سے نبرد آزما ہو رہی تھیں تو ایسے میں ایک ملک جو اس مشکل سے بچا رہا، وہ چین تھا۔ اس کی وجہ انتہائی سادہ سی ہے: چین میں کراؤڈ اسٹرائیک کو بمشکل ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

چینی کمپنیاں ان امریکی کمپنیوں سے سافٹ ویئر خریدنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں جنھوں نے ماضی میں بیجنگ کو سائبر سکیورٹی کے لیے خطرہ قرار دیا۔

باقی دنیا کے برعکس چین مائیکروسافٹ پر زیادہ انحصار نہیں کرتا اور اس کی بجائے مقامی کمپنیوں جیسے علی بابا، ٹینسینٹ اور ہواوے کا استعمال کرتا ہے۔ اس لیے چین میں اس بندش کے بارے میں خبریں غیر ملکی فرمز اور کمپنیوں کے ذریعے سامنے آئیں۔

مثال کے طور پر چین کے سوشل میڈیا پر کچھ صارفین نے شکایت کی کہ وہ ملک میں موجود بین الاقوامی ہوٹلوں جیسے کہ شیرٹن، میریٹ اور حیات میں چیک ان نہیں کر پا رہے۔

چین میں حالیہ برسوں کے دوران حکومتی تنظیمیں، کاروبار اور انفراسٹرکچر آپریٹرز تیزی سے غیر ملکی آئی ٹی سہولیات کی جگہ مقامی سسٹم کو اپنا رہے ہیں۔

کچھ تجزیہ کار اس متوازی نیٹ ورک کو ’سپلانٹرنیٹ‘ کہنا پسند کرتے ہیں۔

سنگاپور میں مقیم سائبر سکیورٹی ماہر جوش کینیڈی وائٹ کہتے ہیں کہ ’یہ چین کی جانب سے غیر ملکی ٹیکنالوجی آپریشنز کو ایک حکمت عملی کے تحت دیکھنے کا ثبوت ہے‘۔

’مائیکروسافٹ چین میں ایک مقامی پارٹنر ۲۱ ویانٹ کے ذریعے کام کرتا ہے، جو عالمی ڈھانچے سے اپنی خدمات کا آزادانہ طور پر انتظام کرتا ہے۔ یہ سیٹ اپ چین میں بینکاری اور ہوابازی جیسے اہم شعبوں کو عالمی رکاوٹوں سے محفوظ رکھتا ہے‘۔

بیجنگ غیر ملکی نظام پر بھروسہ کرنے سے گریز کو اپنی قومی سلامتی کے تحفظ کے طور پر دیکھتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے چند مغربی ممالک نے ۲۰۱۹ء میں چین کی ٹیکنالوجی فرم ہواوے پر پابندی عائد کر دی یا پھر جیسے ۲۰۲۳ء میں برطانیہ میں سرکاری ڈیوائسز پر چین کی سوشل میڈیا ایپ ٹک ٹاک کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی۔

امریکا بھی چین کو جدید سیمی کنڈکٹر چپ کی فروخت پر پابندی کے ساتھ ساتھ امریکی کمپنیوں کو چینی ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کرنے سے روکنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ امریکی حکومت کا کہنا ہے کہ یہ تمام پابندیاں قومی سلامتی کو مدنظر رکھتے ہوئے عائد کی گئی ہیں۔

چین کے سرکاری اخبار ’گلوبل ٹائمز‘ میں سنیچر کے روز چھپنے والے اداریے میں چینی ٹیکنالوجی پر عائد ان پابندیوں کے بارے میں ہلکا سا اشارہ دیا گیا۔

اداریے میں کہا گیا کہ ’ستم ظریفی تو یہ ہے کہ کچھ ملک مسلسل سکیورٹی کے بارے میں بات تو کرتے ہیں لیکن حقیقی سکیورٹی کو نظر انداز کرتے ہیں‘۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایک طرف تو امریکا یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ عالمی ٹیکنالوجی کو کون اور کیسے استعمال کرے لیکن دوسری طرف اس کی اپنی ایک کمپنی کی بے احتیاطی کی وجہ سے دنیا بھر میں افراتفری پھیل گئی۔

گلوبل ٹائمز نے انٹرنیٹ کی بڑی کمپنیوں پر بھی تنقید کی جو اس انڈسٹری پر اپنی ’اجارہ داری‘ قائم کیے ہوئے ہیں: ’نیٹ ورک سکیورٹی کی کوششوں کی قیادت کے لیے مکمل طور پر بڑی کمپنیوں پر انحصار کرنا، جس کی حمایت کچھ ممالک کرتے ہیں، اس سے سکیورٹی کے حوالے سے مزید خدشات جنم لیں گے‘۔

اپنے ملک میں سخت کنٹرول کے باوجود بیجنگ کا اصرار ہے کہ وہ عالمی ٹیکنالوجی مارکیٹ کی وکالت کرتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود ایسا بھی نہیں کہ حالیہ افراتفری سے چین مکمل طور پر محفوظ رہا۔ کچھ ملازمین نے امریکی سافٹ ویئر کمپنی کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی بدولت انھیں کام سے جلدی چھٹی مل گئی۔

جمعے کے روز سوشل میڈیا ایپ ویبو پر ’جلدی چھٹی کے لیے شکریہ مائیکروسافٹ‘ ٹرینڈ کرتا رہا اور لوگ اپنی نیلی اسکرین والی تصاویر بھی شیئر کرتے رہے۔

## کراؤڈ اسٹرائیک کیا ہے؟

یہ ایک سائبر سکیورٹی کمپنی ہے جس کا قیام ۲۰۱۱ء میں عمل میں آیا۔ اس کمپنی کا مقصد دنیا کی بڑی کمپنیوں اور ان کے کمپیوٹر نظام کو خطرات سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس کمپنی کی خصوصیت سائبر سکیورٹی کے تحت اینڈ پوائنٹ تحفظ فراہم کرنا ہے کیوں کہ یہ خطرات سے لیس سافٹ ویئر یا فائلوں کو کارپوریٹ نیٹ ورک تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ اس کمپنی کو یہ ذمہ داری بھی سونپی جاتی ہے کہ وہ صارفین، یعنی بڑی کمپنیوں کے ڈیٹا کو کلاؤڈ پر محفوظ رکھے۔

کراؤڈ اسٹرائیک ٹیکساس میں جارج کرٹز اور دمتری الپرووچ نے شروع کی تھی اور ابتدا سے ہی اس کمپنی نے بظاہر سائبر حملوں کے خلاف کمپنیوں کی مدد کی ہے۔

۲۰۱۶ء میں کراؤڈ اسٹرائیک کو امریکی ڈیموکریٹک نیشنل کمیٹی نے طلب کیا تھا جو کہ ڈیموکریٹک پارٹی کی حکمت عملی تیار کرتی ہے۔ کمیٹی نے اس کمپنی کو اپنے کمپیوٹر نیٹ ورک کے خلاف سائبر حملے کی تفتیش کا کام سونپا تھا۔

## تکنیکی خرابی سے کہاں اور کون متاثر ہوا؟

اس تکنیکی مسئلے کی وجہ سے دنیا بھر میں ٹرانسپورٹ کا نظام، براڈکاسٹر، اسپتال اور دیگر شعبے متاثر ہوئے۔

فضائی کمپنیوں کا شیڈول متاثر ہوا اور ایئرپورٹس پر تعطل دیکھنے کو ملا، برطانیہ اور امریکا میں بڑے ٹی وی چینلز کی نشریات بھی متاثر ہوئیں۔

برطانیہ میں کئی ریل کمپنیوں کا نظام اور شیڈول متاثر بھی ہوا۔ امریکا کی ریاست الاسکا میں پولیس کا کہنا تھا کہ ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے فون ہیلپ لائن بھی دستیاب نہیں تھی۔

پولینڈ میں بالٹک ہب ٹرمینل نے بحری جہازوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ کنٹینر لانے سے گریز کریں۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں چند ڈاکٹروں نے شکایت کی ہے کہ وہ اپنے کمپیوٹر ریکارڈ تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔

(بحوالہ: ’’بی بی سی اردو ڈاٹ کام‘‘۔ ۲۱ جولائی ۲۰۲۴ء)


برصغیر پاک و ہند کا معروف علمی و تحقیقی رسالہ

سہ ماہی ’’تحقیقاتِ اسلامی‘‘ علی گڑھ (بھارت)

اب پاکستان میں دستیاب ہے

زرِ تعاون فی شمارہ: ۴۰۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

تازہ شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۲۴ء) حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

**اسلامک ریسرچ اکیڈمی**

ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

فون: ۰۲۱-۳۶۳۶۸۰۲۰، ۰۳۳۴-۳۹۱۲۷۶۹



**MA'ARIF FEATURE -** Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950